ایک رات کی شادی

جرائم اور سراغرسانی کی پانچ سچی کہانیاں



احمد یار خان

ایک رات کی شادی

جرائم اور سراغرسانی کی پانچ سچی کہانیاں

احمد یار خان

فہرست

پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی تفتیشی کہانیوں کا یہ بارہواں مجموعہ ہے۔
ہر مجموعے کے ساتھ پیش لفظ لکھا جاتا ہے جس کی چنداں ضرورت تو نہیں ہوتی لیکن اُن قارئین کے لیے جن کے ہاتھوں میں محترم احمد یار خان کی کوئی سی کتاب پہلی بار آتی ہے اور وہ اِس مصنّف کی تحریروں سے متعارف نہیں ہوتے، پیش لفظ ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قارئین نے یہ تو تسلیم کر لیا ہے کہ محترم احمد یار خان کی کہانیاں حقیقی ہوتی ہیں لیکن کئی ایک قارئین یہ تسلیم نہیں کرتے کہ کوئی تھانیدار اتنی دیانتداری اور اتنی محنت سے تفتیش اور سراغرسانی کرتا ہوگا۔ یہ وہ قارئین ہیں جنہوں نے اپنے پیارے پاکستان کی پولیس دیکھی ہے اور انگریزوں کا دورِ حکومت نہیں دیکھا۔ انگریز اپنی توہین برداشت کر لیتا تھا، اپنے قانون کی بے حرمتی برداشت نہیں کرتا تھا۔ ہر علاقے کا ڈی ایس پی ہر واردات کی تفتیش پر ذاتی نظر رکھتا اور تاخیر کی جواب طلبی کرتا تھا۔ تھانیداروں کی ترقی کا دارومدار خوشامد پر نہیں بلکہ وارداتوں کی کامیاب تفتیشوں پر ہوتا تھا۔

اوپر والوں کی اتنی سختی ہر تھانیدار کو مجبور کیے رکھتی تھی کہ وہ کھانا پینا اور سونا بھول جائے اور جو واردات ہو گئی ہے اس کے ملزموں کو پکڑے۔ ان حالات میں بیشتر تھانیدار احمد یار خان جیسے ہوتے تھے۔ ہمارے احمد یار خان ذرا زیادہ ہی دیانت دار تھے لیکن وہ اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ اور بالا نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہر تھانیدار کا فرض ہے کہ قانون کا احترام کرے اور دوسروں سے احترام کرائے اور جو نہ مانے اُسے سزا دلائے۔ پاکستان کا قانون تو ہمارے لیے زیادہ مقدس ہے۔ یہ ہمارا اپنا قانون ہے۔

اپنے قانون کی جس طرح مٹی پلید ہو رہی ہے وہ ہم سب دیکھ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون کا تحفظ کرنے والوں کے دلوں میں ہی قانون کا احترام نہیں رہا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پولیس کا استعمال بدل گیا ہے اور اس کے ساتھ مجرم بھی استعمال کی چیز بن گئے ہیں۔ اقتدار کے تحفظ کے لیے پولیس اور سیاست میں جرائم پیشہ لوگوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قانون کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں۔

ان کہانیوں میں آپ کو ایسی دلچسپیاں ملیں گی کہ آپ ہر کہانی ایک ہی نشست میں پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ہر کہانی میں آپ کو اپنے معاشرے کے رنگ ملیں گے اور معاشرے کی خوبیاں اور قباحتیں بھی۔ ایسے مقام بھی آئیں گے جہاں آپ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکیں گے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

ایک رات کی شادی

جُرم کا ارتکاب صرف جرائم پیشہ لوگ ہی نہیں کیا کرتے، مومن بھی بوقتِ ضرورت مجرم بن جایا کرتے ہیں۔ یہ صرف تھانیدار جانتے ہیں کہ انسانی فطرت بڑی مکّار اور عیّار ہے، اپنے اُوپر شرافت اور عبادت کا پردہ بھی ڈال لیا کرتی ہے۔ میں آپ کو ایسے ہی انسانوں کی کہانی سناؤں گا جن کے متعلق کوئی بھی یقین نہیں کیا کرتا کہ وہ کوئی انتہائی معمولی اور بے ضرر سا جُرم بھی کر سکتے ہیں۔

یہ کیس میرے تھانے کا نہیں تھا اور میں اُس وقت تھانیدار بھی نہیں رہا تھا۔ میں پنشن سے پہلے کی چھٹی پر گھر آگیا تھا۔ میرا ایک تھانیدار دوست میرے گاؤں سے پچاس میل دُور ایک تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او تھا۔ بڑا پیارا دوست تھا۔ اُس نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا کہ دو چار دن اُس کے پاس رہوں۔ میں اب فارغ تھا۔ اُس کے ہاں چلا گیا۔ پانچ سات دن ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ دو ہی دن گزرے تھے کہ صبح سویرے اطلاع آئی کہ قصبے سے کوئی نصف میل دور ایک لاش پڑی ہے، اور یہ قتل کی واردات ہے۔ اطلاع لانے والا ایک نمبردار تھا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔

نمبردار نے بتایا کہ لاش کے گلے میں رسّی کس کر بندھی ہوئی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اس رسّی کے پھندے سے مارا گیا ہے۔ لاش کی حالت یہ بتائی گئی کہ دونوں ٹانگوں کا کچھ گوشت بِجّو اور گیدڑ کھا گئے ہیں۔ پیٹ بھی انہی کا پھاڑا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ مقتول قصبے کی ایک... چھوٹی سی مسجد کا امام تھا اور گمنام سا آدمی تھا۔

میں اب جتنے بھی نام لکھوں گا، وہ فرضی ہوں گے۔ واردات کے مقام کا نام ظاہر نہیں کروں گا۔ اس پردہ داری کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقام پاکستان میں ہے اور واردات سے متعلق افراد میں سے بعض، شاید زندہ ہوں گے۔

یہ میرے میزبان اور دوست سب انسپکٹر یعقوب علی کے تھانے کا کیس تھا۔ وہ کوئی اناڑی اور کام چور سب انسپکٹر نہیں تھا۔ میں چونکہ اُس کا مہمان تھا اس لیے اُس نے مجھے کہا کہ میں تفتیش میں اُس کا ساتھ دوں۔ وہ مجھے اپنا اُستاد سمجھتا تھا۔ مجھے اطمینان سا ہُوا کہ ایک مصروفیت مل گئی ہے۔ فراغت مجھے پریشان کر رہی تھی۔

میں یعقوب علی کے ساتھ موقعۂ واردات پر چلا گیا۔ لاش پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ گلے میں رُسّی تھی جسے ایک ہی گانٹھ دی گئی تھی۔ مقتول چونکہ مر چکا تھا اس لیے گانٹھ ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص رات کو قتل ہُوا ہے۔ پیٹ پھٹا ہُوا اور ٹانگوں کا خاصا حصّہ گیدڑوں وغیرہ کا کھایا ہُوا تھا۔ لاش کی جامہ تلاشی لی۔ مقتول نے کھدّر کا کُرتہ پہن رکھا تھا۔ اُس کی جیب سے تین سو چھپن روپے اور چند آنے، ایک چاقو جس کا پھل چھ انچ تھا، ایک نکاح نامہ اور دو چابیاں

برآمد ہوئیں۔

اِن اشیاء کے متعلق کچھ باتیں ضروری ہیں جو آپ ذہن میں رکھیں۔ اُس وقت تین سو پچپن روپے خاصی زیادہ رقم سمجھی جاتی تھی۔ اتنا بڑا چاقو جو کمانی دار تھا، کوئی عام آدمی جیب میں نہیں رکھتا تھا۔ یہ تو چھوٹی سی ایک مسجد کا غریب سا امام تھا۔ اہم چیز نکاح نامہ تھا۔ اس پر چار روز پہلے کی تاریخ تھی۔ اس کے مطابق کسی عبدالمجید کا نکاح کسی رحمت بی بی کے ساتھ پڑھا گیا تھا۔ عورت مطلقہ لکھی ہوئی تھی یعنی اُسے طلاق ہوئی تھی اور اب اُس کا نکاح عبدالمجید کے ساتھ پڑھا گیا تھا۔

ہمیں بتایا گیا کہ مقتول کا اپنا نام عبدالمجید ہے۔ ولدیت بھی لکھی ہوئی تھی لیکن اُسے جاننے والوں کو اُس کی ولدیت معلوم نہیں تھی اس لیے تصدیق نہ ہو سکی کہ یہ نکاح نامہ مقتول کا اپنا ہے۔ یہ اُس کا اپنا ہی تھا کیونکہ یہ اُس کی جیب میں تھا۔

اتنے میں کھوجی آ گیا۔ یعقوب علی نے تھانے سے چلتے وقت اُسے بلانے کے لیے آدمی بھیج دیا تھا۔ لاش کے اِردگرد گیدڑوں وغیرہ نے اور لاش دیکھنے والوں نے کھُرے مٹا دیے تھے۔ کھوجی اپنے فن کا ماہر تھا۔ اُس نے مقتول کی جوتی دیکھی۔ یہ گُرگابی تھی جسے آج کل سلیپشن کہتے ہیں۔ اس کے ایک پاؤں کے نیچے کا تلوا درمیان سے پھٹا ہوا تھا اور دونوں ایڑیاں اس طرح مرمّت کی گئی تھیں کہ آدھی آدھی ایڑیوں پر چمڑا لگا یا گیا تھا۔ مختصر یہ کہ تلووں کی حالت ایسی تھی کہ اُن کا کھُرا (زمین پر ان کے نشان) عام کھُروں سے الگ تھلگ تھا جو آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

کھوجی کے ساتھ اپنا ایک مددگار بھی تھا۔ یعقوب علی نے اپنا ایک کانسٹیبل

اُس کے ساتھ چھوڑا۔ چارپائی منگوائی اور ضروری کاغذی کارروائی کر کے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھجوا دی۔ وہاں سِول (سرکاری) ہسپتال تھا جہاں پوسٹ مارٹم کا انتظام تھا۔ خون، پیٹ کے اعضا اور مواد وغیرہ کا ٹسٹ لاہور ہوتا تھا۔ اس لاش کا صرف پوسٹ... مارٹم درکار تھا۔

نکاح کس کا پڑھا گیا؟

مقتول مسجد سے چند گھر دُور کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ وہاں محلّے والوں سے اُس کے متعلق پوچھا۔ اُس کے مکان کے باہر تالہ لگا ہُوا تھا۔ اُن دو چابیوں میں سے جو لاش سے برآمد ہوئی تھیں، ایک تالے کو لگ گئی۔ تالہ کھول کر ہم اندر گئے۔ کچے فرش کا صحن تھا۔ ایک بڑا کمرہ اور اس کے دائیں اور بائیں دو کوٹھڑیاں تھیں۔ مکان کا کچھ حصّہ اینٹوں کا اور کچھ پتھروں کا بنا ہُوا تھا۔ کمرے کے دروازے کو بھی تالا لگا ہُوا تھا۔ دوسری چابی اس تالے کو لگ گئی۔

کمرے میں کوئی زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک پُرانا ٹرنک تھا۔ مقفل نہیں تھا۔ کھول کر دیکھا۔ کچھ کپڑے تھے اور کچھ اور چیزیں جو تفتیش میں کوئی مدد نہیں دے سکتی تھیں۔ دو چارپائیاں تھیں۔ ان میں ایک اچھی قسم کی چوڑی چارپائی تھی۔ اس پر سفید چادر بچھی تھی۔ لحاف تھا جو تہہ کیا ہُوا نہیں تھا۔ ویسے ہی پائنتی پڑا تھا۔ ہمیں جس چیز نے متوجہ کیا وہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ کچھ بستر پر پڑے تھے اور کچھ چارپائی کے ساتھ فرش پر بکھرے ہُوئے تھے۔

جس واردات کا شکار کوئی عورت ہوئی ہو، یا عورت کسی نہ کسی وجہ سے موقعۂ واردات پر موجود ہو تو ایک آدھ چوڑی ٹوٹ جاتی ہے اور ایک دو ٹکڑے پڑے ملتے ہیں مگر یہاں معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی چوڑیاں ٹوٹی ہیں۔ سوال پیدا ہوا۔ کیا کسی عورت کے ساتھ زبردستی کی گئی یا تشدّد کیا گیا ہے؟ یعقوب علی نے مزید غور سے دیکھا تو بستر کی سفید چادر پر تین چار لمبے بال بھی پڑے مل گئے جو عورت کے ہی ہو سکتے تھے۔

میرا دھیان نکاح نامے کی طرف گیا۔ تین روز پہلے کا یہ نکاح نامہ مقتول کا ہی ہو سکتا تھا اور چوڑیاں اُس کی بیوی کی تھیں۔ مطلقہ اب بیوہ ہو گئی تھی۔

میں نے اور یعقوب علی نے محلّے کے دو تین معززین اور دو تین ایسے آدمیوں سے جو ہر گھر کی خبر رکھتے ہیں، مقتول کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ مقتول کی عمر پینتیس چھتیس سال تھی۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ نو دس مہینے گذرے، یہاں کسی مسجد کی تلاش میں امامت کے لیے آیا تھا۔ اتفاق سے اس مسجد کا امام فوت ہو چکا تھا۔ محلّے والوں نے مسجد مقتول کو دے دی۔ اس کا نام عبدالمجید تھا۔ وہ چلا گیا اور اگلی شام ایک ٹرنک اور ایک بستر لے کے آ گیا۔ اُس کے ساتھ بیوی بچّے نہیں تھے۔ کہتا تھا کہ بیوی مر گئی ہے اور بچّہ کوئی نہیں۔ سب نے کہا کہ مقتول خاموش طبع اور نیک انسان تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ کسی آدمی کو اس لیے نیک کہنا کہ وہ نماز روزے کی پابندی کرتا ہے اور امام ہے، میرے لیے قابلِ قبول نہیں۔ مجھے مذہب سے ہٹ کر بتاؤ کہ لوگ اُسے کیوں نیک سمجھتے تھے۔ محلّے کے معزز افراد نے مجھ پر ثابت کر دیا کہ وہ واقعی نیک

شریف اور چُپ چاپ زندگی بسر کرنے والا انسان تھا۔ اِن سب نے حیرت کا اظہار کیا کہ اس بے ضرر انسان کو کس نے قتل کیا ہے اور قتل کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ مقتول شریف اور بے ضرر انسان تھا۔

یہ بھی بتایا گیا کہ تین دنوں سے وہ کسی کو بتائے بغیر کہیں چلا گیا تھا یعقوب علی نے اِن لوگوں سے پُوچھا کہ مقتول نے کسی رحمت بی بی کے ساتھ شادی کی ہے، کیا وہ اس نکاح سے واقف ہیں؟ ۔۔۔ نہیں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اُس نے تین روز پہلے کسی مطلقہ کے ساتھ نکاح پڑھوایا ہے۔ اسے بہت قریب سے جاننے والوں سے بھی پُوچھا۔ انہوں نے بھی کہا کہ مقتول نے نکاح نامے والی تاریخ کسی سے نکاح نہیں پڑھایا۔ اگر کہیں اور جا کے پڑھ لیا ہو تو وہ نہیں جانتے۔

مقتول کا کھانا لوگوں کے گھروں سے آتا تھا محلے والوں کی مدد سے ہمیں دو بچے مل گئے جو اُس شام مقتول کے گھر کھانا دینے گئے تھے۔ وہ گیارہ بارہ سال عمر کے تھے۔ دونوں مختلف گھروں کے تھے۔ دونوں مغرب کی نماز کے بعد کھانا دینے گئے تھے۔ بچوں سے ہم نے کُریدنا شرُوع کیا۔ انہوں نے بتایا کہ مقتول گھر میں ہر روز کی طرح اکیلا تھا۔ ہر روز کی طرح بچوں سے کھانا لے کر اُس نے دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور مسکرایا۔ اُس کے گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ عبدالمجید کوئی اور ہے جس کا نکاح رحمت بی بی سے پڑھا گیا ہے، مگر نکاح نامہ اس کے پاس کیوں تھا؟ ۔۔ اس سوال کا جواب ایک اور شخص دے سکتا تھا۔ وہ تھا بڑی مسجد کا خطیب۔ نکاح رجسٹر اُس کے پاس رہتا تھا۔ اُس وقت نکاح کے فارم الگ نہیں ہوتے تھے۔ رجسٹر ہوتا تھا۔

اس میں چھپے ہوئے فارم ہوتے تھے۔ ایک لڑکے کو، دوسرا لڑکی کو دے دیا جاتا اور ایک (کاؤنٹر فائل) رجسٹر میں لگا رہتا تھا۔ رجسٹر نکاح خوان کے پاس رہتا تھا۔ کوئی اور مولوی نکاح پڑھائے تو رجسٹر نکاح خوان سے حاصل کر لیتا تھا۔

خطیب کو ہم نے نکاح رجسٹر کے ساتھ مقتول کے گھر بلا لیا۔ اس میں کاؤنٹر فائل لگا ہوا تھا۔ ہمارے پوچھنے پر خطیب نے بتایا کہ مقتول نکاح کی تاریخ کو عصر کی نماز کے بعد گیا تھا اور یہ کہہ کر اُس سے رجسٹر لایا تھا کہ ایک غریب آدمی اور غریب بیوہ کا نکاح پڑھنا ہے۔ عشاء کی نماز سے کچھ دیر پہلے اُس نے رجسٹر واپس کر دیا تھا۔

"آپ نے رجسٹر کھول کر دیکھا تھا کہ نکاح کس کا پڑھا گیا ہے اور کیا اندراج صحیح کیے گئے ہیں؟"

"یہ تو مجھے دیکھنا ہی ہوتا ہے" خطیب نے جواب دیا — "میں نے نام پڑھا تو یہ عبدالمجید تھا۔ مقتول کا نام بھی عبدالمجید تھا۔ میں نے اُس سے ہنس کر پوچھا کہ اُس نے اپنا نکاح پڑھا ہے؟... اُس نے جواب دیا تھا کہ میرا نکاح جب کبھی ہو گا وہ آپ پڑھیں گے اور اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ ایک مجھ جیسا غریب اور میرا ہم نام ہے۔"

مقتول کی جیب سے جو نکاح نامہ نکلا، اسے ہم نے کاؤنٹر فائل سے ملایا۔ ایک ہی تحریر تھی۔ اس پر عبدالمجید کے دستخط تھے۔ رحمت بی بی کا انگوٹھا لگا ہوا تھا۔ دو گواہوں کے بھی دستخط تھے۔ دستخطوں سے پتہ چلتا تھا کہ دونوں بہت تھوڑے پڑھے لکھے ہیں۔

ہماری مدد یہ دو گواہ کر سکتے تھے۔

عورت رہزنوں کے کام کی تھی

ایک کانسٹیبل جو باہر کھڑا تھا، ایک آدمی کو اندر لایا۔ اُس نے بتایا کہ عشاء کی نماز کے بعد مقتول کو اُس نے کہیں سے اپنے گھر کو آتے دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت تھی جس نے سفید برقعہ (اُس دَور کا شٹل کاک کی طرح) اوڑھ رکھا تھا۔ اُس کا مُنہ برقعے میں تھا۔ مقتول نے تالا کھولا اور عورت کے ساتھ وہ اندر چلا گیا تھا۔

یہ سُن کر میں نے دریافت کیا کہ مقتول نے عشاء کی نماز پڑھائی تھی یا نہیں۔ اُس نے نماز پڑھائی تھی۔ اُس کا مکان مسجد سے تھوڑی ہی دُور تھا۔ یہ کوئی نہ بتا سکا کہ وہ اپنے گھر گیا تھا یا کہیں اور چلا گیا تھا۔ یعقوب علی کے ایک سوال کے جواب میں محلّے کے معززین نے بتایا کہ مقتول کے گھر میں کبھی کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ انہی سے پتہ چلا کہ عشاء کی نماز آخری نماز تھی جو اُس نے پڑھائی۔ اگلی صبح اُس نے اذان بھی نہ دی۔ اُس کے گھر جا کے دیکھا، باہر تالہ لگا ہُوا تھا۔

ہمارے سامنے جو سوال اور شکوک آئے وہ یہ تھے؛

مقتول نے عشاء سے پہلے نکاح رجسٹر خطیب کو واپس کیا تھا اور وہ عشاء کی نماز کے بعد ایک عورت کو ساتھ لایا۔ کیا نکاح اُس نے اپنا پڑھایا تھا؟ کیا وہ عورت جو اُس کے ساتھ آئی تھی وہ اُس کی بیوی تھی؟ کیا کوئی آدمی اپنا نکاح خود پڑھا سکتا ہے؟ نہیں۔ یہاں سے یہ شک پیدا ہُوا کہ وہ کسی اور عورت

کو ساتھ لایا تھا جو اُس کی بیوی نہیں تھی۔ اس عورت کے لواحقین آگئے۔ عورت اُن کے ساتھ جانا نہیں چاہتی ہوگی۔ انہوں نے اُسے مارا پیٹا اور گھسیٹا ہوگا۔ اسی لیے اتنی زیادہ چوڑیاں ٹوٹیں۔ یہی لوگ مقتول کو بھی اُٹھا کر یا کسی طرح اپنے ساتھ لے گئے اور قصبے سے باہر جا کر اُس کے گلے میں رسّی ڈالی اور قتل کر دیا۔ وہ عورت کو اپنے ساتھ لے گئے۔

ایک شک یہ بھی تھا کہ مقتول اس عورت کے ساتھ نکاح پڑھا کر اُسے اپنے ساتھ گاؤں سے لے جا رہا تھا۔ اس عورت کے کسی اور امیدوار نے راستے میں مقتول کو ختم کیا اور عورت کو اُٹھا لے گیا۔ یہ واردات رہزنی کی نہیں تھی، ورنہ مقتول کی جیب میں تین سو پچپن روپے نہ ہوتے اور رہزن اتنا بڑا چاقو بھی لے جاتے۔

یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عورت نے بہت سے زیورات پہن رکھے ہوں۔ زیورات کے علاوہ وہ خود بھی قیمتی ہوگی۔ نکاح نامے میں اُس کی عمر تیس سال لکھی ہوئی تھی۔ یہ جوانی کی عمر ہوتی ہے۔ رہزن زیورات کے ساتھ عورت کو بھی لے گئے اور انہوں نے مقتول کو ختم کرنا بہتر سمجھا ہوگا۔

رحمت بی بی کون تھی؟ کیا وہ کہیں باہر سے آئی تھی یا اسی قصبے کی رہنے والی تھی؟ اور ایک سوال یہ بھی سامنے آیا کہ نکاح اگر مقتول کا ہی پڑھا گیا تھا تو اُس نے محلے والوں سے کیوں چھپایا؟

میں نے اور یعقوب علی نے مقتول کے گھر ہی ذرا ایک طرف ہو کر ان سوالوں اور شکوک پر غور کیا اور طے کیا کہ کون سی لائن اختیار کی جائے۔ دن کے دو بج رہے تھے۔ وہاں سے اُٹھنے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم قتل کی کم از کم

تحریک یعنی باعث معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ قتل انتقامی کارروائی بھی معلوم ہوتا تھا اور یہ رہزنوں کی کارروائی بھی لگتی تھی۔ زیورات اور عورت رہزنوں کے کام کی چیزیں تھیں۔

رحمت بی بی کون تھی؟

کھوجی آگیا۔ اُس نے بہت محنت کی تھی۔ وہ صبح سے کھُرا اُٹھا رہا تھا اور دن کے دو بج چکے تھے۔ وہ اپنے ایک ساتھی اور کانسٹیبل کو وہیں چھوڑ آیا تھا تاکہ اُس کے تلاش کیے ہُوئے کھُرے سے کوئی نہ گذرے۔ یہ خیال بھی رکھیں کہ وہ علاقہ میدانی نہیں، کھڈ، نالوں، ٹیلوں، گھاٹیوں اور سلوں والی چٹانوں کا علاقہ ہے۔ وہاں کھُرا اٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ چلتے چلتے راستہ یوں نیچے چلا جاتا ہے جیسے زمین کو کاٹ کر ایک دیوار اِدھر اور ایک اُدھر کر دی گئی ہو۔ آگے کسی برساتی ندی کا ریتلا پاٹ ہوگا۔ اس میں کہیں کہیں پانی بھی ہوتا ہے اور پانی نہ ہو تو ریت گیلی ہوگی۔ بعض جگہ ریت اتنی گیلی ہوتی ہے کہ اس پر سے گزرو تو پاؤں کے نیچے دب کر پھر اُوپر آجاتی ہے اور کھُرا مٹ جاتا ہے۔

کچی مٹی پر چلتے چلتے ایسی زمین آجاتی ہے جس پر باریک باریک اور نوکیلی کنکریاں بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ ان پر کھُرا جمتا نہیں۔ کھوجی کھُرا اُٹھاتے ہیں یعنی پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے آگے بڑھتے جاتے ہیں تو کھُرا غائب ہو جاتا ہے۔ میدانی علاقوں کے کھوجی اس علاقے میں اکثر ناکام ہو جاتے ہیں۔

کھوجی ہمیں اپنی رپورٹ دینے لگا تو سب انسپکٹر یعقوب علی نے

اُسے روک کر ایک اور کارروائی کی۔ اُس نے اُس جگہ کے نمبردار، ذیلدار اور محلے کے معززّ افراد کو بلایا۔ قصبوں کے "معزز" حضرات میں ایک نسل "انعام خور" کہلایا کرتی تھی۔ ہر قصبے اور شہر میں دو چار انعام خور ہُوا کرتے تھے۔ انہیں سرکارِ انگریزی کی طرف سے الاؤنس ملا کرتا تھا۔ ان کا کام مخبری تھا۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کو بغاوت سے محفوظ رکھنے کے لیے چیدہ چیدہ افراد کو نمبرداری، ذیلداری، سفید پوشی اور انعام خوری عطا کر رکھی تھی۔ بعض کو ویسے ہی درباری بنا رکھا تھا۔ یہ لوگ پولیس کی بہت مدد کیا کرتے تھے مگر کسی مجرم کو بچانا چاہتے تو پولیس کو گمراہ بھی کر دیا کرتے تھے۔ مُنہ مانگی رشوت لے کر بھی پولیس کو گمراہ کیا کرتے تھے۔

انگریزی حکومت بوریا بستر لپیٹ گئی تھی۔ انعام خوروں اور سفید پوشوں کی وہ حیثیت ختم ہو گئی تھی لیکن انہوں نے تھانیداروں کی خوشامد اور اپنے پرائے کے خلاف مخبری جاری رکھی ہوئی تھی۔ یہ اُن کی فطرت بن چکی تھی۔ تھانیدار انہیں ہوا دے کر ان سے خوب کام لیتے تھے۔ ان کے علاوہ پولیس کے ہاتھ میں چھوٹے موٹے جرائم کرنے والے چرسی اور جواری تھے جو کامیاب مخبر تھے۔ ان کی بیویاں اور مائیں ان سے زیادہ کامیاب مخبری کرتی تھیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

میں یعقوب علی کی کارروائی کا ذکر کر رہا تھا۔ اُس نے ان لوگوں کے ذمّے یہ کام لگایا کہ معلوم کریں کہ تین روز پہلے جس رحمت بی بی مطلقہ کا نکاح عبدالمجید کے ساتھ پڑھا گیا ہے وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے اور اب کہاں ہے۔

قصبہ جو آج کل باہر کے پیسے سے شہر بن گیا ہے، اُس وقت چھوٹا سا تھا مگر

ایک اور مشکل پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے وہاں ہندو اور سکھ بھی رہتے تھے مسلمانوں کے محلّے الگ تھے۔ آبادی بھی تھوڑی تھی۔ اب ہندو سکھ ہندوستان چلے گئے تھے اور ان کے مکانوں میں سرحد پار کے مہاجرین آ گئے تھے۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ رحمت بی بی کوئی مہاجر ہو گی۔ اگر ایسا تھا اور مقتول کے قتل کے ساتھ اس کا تعلق تھا تو اس کی تلاش میں مشکل پیدا ہونے کا ڈر تھا۔ بہر حال یعقوب علی نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہہ کر رحمت بی بی کا سُراغ لگانے کا انتظام کیا اور وہ افراد جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، قصبے میں پھیل گئے۔ رحمت بی بی کی ولدیت بھی نکاح نامے میں لکھی ہوئی تھی۔

عورت کے ساتھ دو آدمی

کھوجی نے رپورٹ دی۔ اُس نے بتایا کہ وہ اس خیال سے کھُرے ڈھونڈتا رہا کہ مقتول قصبے سے کہیں جا رہا ہو گا اور راستے میں مارا گیا مگر کھُرے کچھ اور بتا رہے تھے۔ مقتول جا نہیں رہا تھا، آ رہا تھا اور اُس کے ساتھ ایک عورت تھی۔ جہاں مقتول قتل ہُوا وہاں سے عورت کا کھُرا قصبے کی طرف آ رہا تھا۔ ان کے ساتھ دو اور آدمی تھے۔ عورت کا کھُرا اُس کی سینڈل کا تھا۔ اُن دنوں باٹا کے ایک خاص قسم کے زنانہ سینڈل بہت مشہور ہوئے تھے۔ اُن کی ایڑی لکڑی کی ہوتی تھی۔ پاؤں چونکہ چھوٹا تھا اس لیے کھوجی نے اسے زنانہ پاؤں قرار دیا۔ سینڈل کے نشان سے تصدیق ہو گئی کہ یہ عورت تھی۔

کھوجی اور اُس کے ساتھی نے بڑی ہی محنت کی تھی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مقتول کے پاؤں میں جو جُوتی تھی اُس کا ایک تلوا پنجے کے قریب سے ایسے طریقے سے مرمّت کیا ہُوا تھا اور دونوں ایڑیوں کے نیچے چمڑہ اس طرح لگا ہُوا تھا کہ دوسرے کھُروں میں یہ کھُرا صاف پہچانا جاتا تھا۔ اس سراغ پر کھوجی نے مقتول کا کھُرا ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ دیہات کی طرف سے قصبے کی طرف آرہا تھا جہاں اُس کا کھُرا تھا اُس کے ساتھ عورت کا کھُرا بھی تھا۔ ان کے ساتھ دو آدمی تھے۔

یہ کھُرے کچھ دُور تک نظر آئے تھے پھر غائب ہو گئے کیونکہ علاقہ ایسا تھا کہ آگے کھُرے نہیں مل رہے تھے۔ مقتول کا کھُرا جائے واردات تک ان کے ساتھ آیا۔ کھوجی کو عورت کا کھُرا قصبے کی طرف آتا نظر آگیا جو آبادی کے قریب آکر غائب ہو گیا۔ آگے پکّی گلیاں تھیں اور صبح لوگوں کی آمد و رفت نے کھُرے مٹا ڈالے تھے۔

جب عورت کا ذکر آیا تو مجھے ایک اور خیال آگیا۔ میں نے کھوجی سے کہا کہ وہ صحن میں ذرا گھوم پھر کر دیکھے۔ صحن کچّا تھا اور کشادہ۔ کھوجی نے صحن سے بھید لینا شروع کیا تو بیت الخلاء کے سامنے جہاں فرش زیادہ کچّا اور نمناک بھی تھا اُسے کھُرا نظر آگیا۔ اُس نے نعرہ لگانے کے انداز سے کہا ”یہ ہے۔ وہی ہے۔“

میں نے اور یعقوب علی نے بھی وہ کھُرا دیکھا۔ یعقوب علی اپنے کام میں دلچسپی لینے والا تھانیدار تھا۔ اُس نے مقتول کا مکان مقفّل کیا اور مجھے کہنے لگا کہ کھوجی کے ساتھ چلتے ہیں۔ اُسے کھُرا شناسی کی سُوجھ بوجھ مجھ سے زیادہ تھی، بلکہ وہ خود بھی کھوجیوں کی طرح کھُرا اُٹھا سکتا تھا۔ اُس کے کہنے پر کھوجی اُسے قصبے کے اُس طرف لے گیا جدھر عورت کا کھُرا نظر آیا تھا۔

جہاں کھرا ختم ہوتا تھا، وہاں کھڑے ہو کر دیکھا۔ کھرے کا رُخ ایک گلی کی طرف تھا جہاں مقامی لوگ رہتے تھے۔ یہ محض قیاس تھا کہ عورت دو آدمیوں کے ساتھ اس گلی میں داخل ہوئی ہوگی۔ ہم موقعۂ واردات پر گئے اور وہاں سے کھوجی کی راہنمائی میں کھرے دیکھے اور وہاں تک چلے گئے جہاں تک کھرے نظر آتے تھے۔ یہاں میں آپ کو یہ بتا دوں کہ کھرے اتنی آسانی سے نہیں ملے تھے جتنی آسانی سے میں بیان کر رہا ہوں اور آپ سُن رہے ہیں۔ بعض جگہ کھرے ایسے تھے جو عام آدمی کو نظر ہی نہ آتے۔ وہ صرف کھوجی اور کسی تھانیدار کو ہی نظر آسکتے ہیں۔ یہ بڑا مشکل اور پیچیدہ فن ہے لیکن بڑا ہی کارآمد۔

یہی کہا جاسکتا تھا کہ مقتول نے چوری چھپے رحمت بی بی سے نکاح پڑھوایا اور رات ہی رات اُسے کسی گاؤں میں لے گیا۔ وہاں اُس کے رشتہ دار ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اُس کے دشمن بھی ہوں۔ وہ قصبے کو واپس آرہا تھا تو راستے میں قتل ہو گیا اور عورت غائب ہو گئی۔ یہ بھی قابلِ غور تھا کہ مقتول رات کو کیوں واپس آرہا تھا؟

ہمیں اب آگے دو چار گاؤں سے معلوم کرنا تھا کہ کسی نے مقتول کو وہاں سے گزرتے دیکھا تھا یا نہیں۔ یہ بھی پتہ چلانا تھا کہ کوئی اُسے جانتا تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟ شام ہو چلی تھی۔ ہم خود تو آگے نہیں جاسکتے تھے۔ ہمارے ساتھ قصبے کا جو نمبردار تھا اُسے کہا کہ وہ خود جائے یا کسی اور کو بھیجے اور یہ جو راستہ آگے کو جاتا ہے، اس کے اردگرد کے تین چار گاؤں کے نمبرداروں اور چوکیداروں کو تھانے پہنچنے کی اطلاع دے۔

یعقوب علی کو پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی دیکھنی تھی۔ شام بھی ہو چلی تھی اس

لیے ہم تھانے چلے گئے۔

ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، عورت کا کھرا۔۔۔ ایک معمّہ

اُس رات کو ہم کھانا کھا کر اطمینان سے اسی واردات کی باتیں کر رہے تھے۔ اُس وقت تک ہمیں جو سراغ ملے تھے، وہ یہ تھے ۔۔ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ملیں۔ ایک عورت کا کھرا ملا۔ یہ پتہ چلا کہ مقتول کے ساتھ ایک عورت بھی اور کسی رحمت بی بی کا نکاح کسی عبدالمجید کے ساتھ پڑھا گیا تھا جس کے متعلق یقین کی حد تک شک تھا کہ عبدالمجید مقتول نے اپنا نکاح خود پڑھا تھا۔۔۔ مگر اس سے ہماری کوئی مدد نہ ہوئی۔ معمّہ ابھی معمّہ ہی تھا۔ ہمیں قاتل کی بُو بھی نہیں ملی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی آیا۔ وہ اثر درسوخ والا اور حلیہ پُرزہ "معزز" آدمی تھا۔ اُس نے بتایا کہ نکاح کی تصدیق کہیں سے بھی نہیں ہو سکی۔ البتہ ایک رحمت بی بی کا سُراغ ملا ہے جس کی ولدیت یہی ہے لیکن اُس کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلّق نہیں ہو سکتا۔ اس شخص نے اپنی بیوی سے اس رحمت بی بی کی عمر معلوم کرائی تھی۔ بیوی نے تیس سال کے لگ بھگ بتائی تھی۔ نکاح نامے میں بھی تیس سال لکھی ہوئی تھی۔

"نہ جی!"۔۔۔ یعقوب علی نے کہا۔ "وہ بڑا معزز اور شریف گھرانہ ہے۔ اس گھر کی کسی عورت کا مقتول جیسے آدمی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا"۔۔۔ اُس نے اس معزز آدمی کو باہر بیٹھنے کو کہا اور مجھے کہنے لگا۔ "دیکھو ملک بھائی! یہ لوگ کتنے کمینے ہیں۔ شریف آدمیوں کو ذلیل کرانے سے بھی باز نہیں آتے۔

یہ حس رحمت بی بی کی خبر لایا ہے، اُس کا خاوند خواجہ اللہ بخش بڑا ہی نیک اور پارسا آدمی ہے صوم و صلوٰۃ کا ایسا پابند کہ اِدھر سے اُسے موت ہی ہٹا سکتی ہے۔ شہر کی چاروں مسجدوں کی مرمّت اور دیکھ بھال اُس نے اپنے ذمّے لے رکھی ہے وہ کھالوں کا آڑھتی ہے۔ ذرا دیکھو یہ آدمی جسے ہم معزز کہا کرتے ہیں، خواجہ اللہ بخش جیسے آدمی کو رُسوا کرنے پر اُتر آیا ہے۔"

میں ایسے "معزّزین" سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ سارے ہندوستان میں پائے جاتے تھے۔ اب پاکستان اِن سے بھرا پڑا ہے۔ ہماری حکومتیں انہیں خوب استعمال کرتی ہیں اور یہ لوگ دراصل پولیس کے مخبر ہوتے ہیں کسی بے گناہ کو خراب کرنے کے لیے پولیس کے چکّر میں ڈالنا ہو تو یہ معزّزین قابلِ اعتماد جھوٹے گواہ لے آئیں گے اور بے گناہ کو گناہگار ثابت کر دیں گے۔

اس کے بعد دو اور آدمی آئے۔ دونوں نے ایک جیسی رپورٹ دی کہ کسی ایسی رحمت بی بی کا سراغ نہیں ملا جس کا نکاح کسی عبدالمجید کے ساتھ پڑھا گیا ہو۔ یعقوب علی نے مہاجروں میں سے دو چار آدمی اپنے مخبر بنا رکھے تھے۔ اُن کی طرف سے بھی یہی رپورٹ آئی کہ کسی بھی مہاجر گھرانے میں کسی بیوہ کا کسی کے ساتھ نکاح نہیں پڑھا گیا۔

رات غالباً گیارہ بج رہے تھے کہ دو گاؤں کے نمبردار آ گئے۔ یہ قصبے کے نمبردار کا انتظام تھا۔ ہم نے دونوں کو اکٹھے بٹھا لیا اور پوچھا کہ یہاں کا ایک مولوی عبدالمجید اُن کے گاؤں کی طرف گیا ہو گا۔ انہیں ہم نے یہ نہ بتایا کہ وہ قتل ہو گیا ہے۔ انہیں جو آدمی بلانے آیا تھا، اُس نے بھی انہیں اس کے سوا کچھ نہ بتایا کہ انہیں

تھانے طلب کیا گیا ہے یعقوب علی نے اس آدمی کو اصل بات پوشیدہ رکھنے کی ہدایت کی تھی۔

ایک نمبردار نے ہنس کر کہا ۔" کیا بات ہے حضور! مولوی عبدالمجید کی بڑی پُوچھ ہو رہی ہے۔ دو روز پہلے بھی شہر کے ایک صاحب ان کو پوچھتے پھر رہے تھے۔ آج آپ پُوچھ رہے ہیں۔"

" وہ کون تھا؟" میں نے پوچھا ۔" تم جانتے ہو اُسے جو اُسے پوچھتا پھر رہا تھا؟"

" ہاں جی!" نمبردار نے جواب دیا ۔" میں اُسے بھی جانتا ہوں جو مولوی عبدالمجید کو پوچھتا پھر رہا تھا۔ میرے گاؤں سے کوئی چار کوس دُور مولوی عبدالمجید کے رشتہ دار رہتے ہیں۔ یہ میں اس لیے جانتا ہوں کہ تقریباً ایک سال گذرا، مولوی عبدالمجید ہمارے گاؤں میں مسجد کی تلاش میں آیا تھا۔ ہمارے پاس اپنے شاہ صاحب ہیں۔ وہی امامت کراتے ہیں۔ مولوی عبدالمجید کی باتیں مجھے اتنی اچھی لگیں کہ میں نے اُسے کھانے کے لیے روک لیا۔ اُس نے مجھے اُس گاؤں کا نام بتایا تھا جہاں اُس کے رشتہ دار رہتے ہیں۔ کہتا تھا کہ وہ رشتہ داروں کے سر پر فارغ نہیں بیٹھنا چاہتا۔ اس کے بعد میں شہر (قصبے میں) آتا رہا۔ تین چار دفعہ اُس سے ملاقات ہوئی تھی... اور یہ آدمی جو دو روز پہلے اُس کی پوچھتا پھر رہا تھا وہ یہاں کا کاروباری آدمی ہے۔ اُس کا لکڑی کا کاروبار ہے۔ عموماً دیہات میں کھڑے درخت خریدنے کے لیے آیا کرتا ہے۔ درخت کاٹنے والے اُسے دیہات سے ملتے ہیں اور اونٹ بھی اُسے دیہات سے ہی ملتے ہیں جن پر وہ کٹے ہوئے

درخت لاد کر لاتا ہے۔ اس کا نام خواجہ امین ہے۔"

"خواجہ امین کب تمہارے گاؤں گیا تھا؟" یعقوب علی نے پوچھا۔

"اور اُس نے کیا پوچھا تھا؟"

"میرا خیال ہے آج تیسرا دن ہے" — نمبردار نے جواب دیا — "میں باہر اپنے کھیتوں میں تھا۔ وہ گذر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر رُک گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ درخت ڈھونڈتے پھر رہے ہو؟ کہنے لگا، نہیں، ایک آدمی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ کسی نے بتایا ہے کہ وہ اِدھر کے کسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اُس نے عبدالمجید کا نام لیا تو میں نے اُسے اُس کے گاؤں کا نام اور راستہ بتا دیا، اور وہ چلا گیا۔"

نمبردار اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکا۔ دوسرے نمبردار نے بتایا کہ ایک سال پہلے عبدالمجید اُس کے گاؤں بھی مسجد کی تلاش میں گیا تھا اور اُن کی مسجد کے امام کے ہاں ایک رات ٹھہرا تھا۔ اُس نمبردار کو اُس کے متعلق اور کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

مقتول کا چلن اچھا نہ تھا

میں وہاں کے کسی بھی آدمی کو نہیں جانتا تھا۔ یعقوب علی سے پوچھا کہ خواجہ امین کون ہے اور وہ مقتول کے پیچھے کیوں گیا ہوگا۔ یعقوب علی نے بتایا کہ خواجہ امین اُسی خواجہ اللہ بخش کی بیوی کا بھائی ہے جس کے متعلق وہ بتا چکا ہے کہ نیک اور پارسا ہے اور کھالوں کا کاروبار کرتا ہے۔

"لیکن میں اس خاندان کے کسی فرد پر کوئی شک نہیں کر سکتا" — یعقوب علی

نے کہا ۔ "اگر خواجہ امین مقتول کے پیچھے گیا تھا تو مجھے یقین ہے کہ مقتول مسجد کی امامت چھوڑ کر چلا گیا ہوگا۔ شاید کسی وجہ سے ناراض ہو کر گیا ہو۔ یہ خواجہ خاندان مذہب پرست ہے۔ خواجہ امین اسے گناہ سمجھتا ہوگا کہ اُن کا امام ناراض ہو کر چلا جائے۔"

"پہلے یہ تو معلوم کر لو کہ اس مسجد کا سرپرست یہ خواجہ خاندان ہے؟" — میں نے اُسے کہا ۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ خواجے اسی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں؟ معلوم کرو کہ خواجہ امین کا اس مسجد کے ساتھ کیا تعلق ہے ... اگر تم اس لیے اس خاندان پر شک نہیں کرتے کہ یہ نمازی اور پرہیز گار خاندان ہے تو میں تمہیں عقل مند تھانیدار نہیں کہوں گا۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان دولت مند ہے اور کاروباری تو ہے ہی۔ میرا تجربہ کچھ اور کہتا ہے۔ دولت عموماً عبادت پر غالب آجایا کرتی ہے۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ خواجہ امین سے پوچھا جائے کہ وہ مقتول کے پیچھے کیوں گیا تھا؟"

"پوچھو گے تو کہہ دے گا کہ وہ رُوٹھ کر چلا گیا تھا اور میں اُسے منا کر واپس لانے گیا تھا" — میں نے کہا ۔ "مقتول کو نہ تم جانتے تھے نہ میں اُس سے واقف تھا۔ اُس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ وہ اُن پیشہ ور اماموں میں سے تھا جو چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں یا چھوٹے چھوٹے گاؤں کی مسجدوں میں امامت کیا کرتے ہیں اور با جماعت نماز پڑھانے کے سوا مذہب کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ مقتول کا کردار بھی مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میرے پاس اس کا

ثبوت تو کوئی نہیں لیکن میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اُس نے اس رحمت بی بی کے ساتھ اُس کی مرضی کے بغیر نکاح پڑھایا ہے اور نکاح خواں بھی خود ہی بنا تھا۔ جہاں تک میں مذہب کو سمجھتا ہوں، یہ غیر شرعی اور غیر قانونی حرکت ہے اُس نے نکاح اتنا خفیہ کیوں کیا کہ کسی کو پتہ ہی نہ چلنے دیا؟ پھر اُس رات اس عورت کی چوڑیاں توڑ کر کسی کو بتائے بغیر غائب ہو گیا؟ .... اور اُس کی جیب سے جو چاقو برآمد ہوا ہے۔ اتنا بڑا کمانی دار چاقو تم جانتے ہو کون لوگ اپنے پاس رکھا کرتے ہیں"۔

"تو پھر خواجا امین سے بات کر لیتے ہیں"۔ یعقوب علی نے کہا۔

"اس سے پہلے اُس گاؤں چلتے ہیں جہاں مقتول کے رشتہ دار رہتے ہیں" ــ میں نے کہا ــ "جو بات تمہیں وہاں سے معلوم ہوگی وہ خواجا امین سے حاصل نہیں ہو سکتی"۔

نمبر داروں کو ہم نے فارغ کر دیا اور انہیں کہا کہ تھانے میں اُن کے ساتھ جو باتیں ہوئی ہیں، اُن کا ذکر کہیں نہ ہو۔ اُن سے ہم نے اُس گاؤں کا نام اور راستہ معلوم کر لیا تھا جہاں مقتول کے رشتہ دار رہتے تھے۔

رات گذر گئی۔ صبح کی اذان کے ساتھ میں اور یعقوب علی گھوڑیوں پر نکل کھڑے ہوئے۔ ہمارے ساتھ دو کانسٹیبل سائیکلوں پر تھے۔ سات میل کوئی فاصلہ نہیں تھا لیکن علاقہ ٹیلوں اور گھاٹیوں کا تھا جن کی وجہ سے وقت زیادہ لگ گیا۔ ہم اُس گاؤں میں پہنچے تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ گاؤں چھوٹا سا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر باہر گھومتے پھرتے لوگ جہاں تھے، وہیں جام ہو گئے۔ پہلے آدمی سے ہی پوچھا تو اُس نے مقتول کے رشتہ داروں کا گھر بتا دیا۔

ہم اندر چلے گئے۔

اُس کی بیوی کسی کے ساتھ بھاگ گئی

گھر میں دو عورتیں تھیں اور ایک بوڑھا آدمی۔ پولیس کو گھر میں دیکھ کر وہ سُن ہو گئے۔ یعقوب علی نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ ہم کسی کو گرفتار کرنے نہیں آئے۔ کچھ پوچھنے آئے ہیں۔ وہ غریب سے کسان تھے۔ اتنے میں ایک جوان آدمی دوڑتا ہُوا آیا اور ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"حضور!" اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ۔"اگر اُس نے کوئی جرم کیا ہے تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ ہم نے اُسے کہہ دیا تھا کہ ہم اُسے اس گھر میں نہیں رکھ سکتے۔ ہم نے اُسے گھر سے نکال دیا تھا۔"

میں نے گھر والوں سے کہا "ٹھیک بچو! بزدلوں کی طرح گھبرا نہ جاؤ چارپائی لاؤ۔ ذرا بیٹھ کر بات کریں گے۔"

ایک چارپائی لانے کے لیے سارے گھر میں ہڑبونگ مچ گئی۔ چارپائی بچھی تو ہم بیٹھ گئے۔

"اب بتاؤ تم کس کی بات کر رہے تھے"۔ یعقوب علی نے اس جوان آدمی سے پوچھا ۔"پوری بات سُناؤ۔"

"میں مجید کی بات کر رہا تھا جی!" اُس نے کہا ۔"لوگ اسے مولوی عبدالمجید کہتے ہیں۔"

"وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں سے چلا گیا تھا جی!" — اُس نے جواب دیا۔
"عورت اُس کے ساتھ گئی تھی؟"
"اسی لیے تو ہم نے اُسے گھر سے نکال دیا تھا جی، کہ وہ معلوم نہیں کس کی عورت ساتھ لے آیا تھا" — اُس نے کہا — "اس عورت کو لے جانے کے لیے پہلے ایک آدمی آیا تھا پھر دو آئے تھے۔"

"اب پوری بات سُنا دو" — میں نے کہا اور اُسے بتایا کہ وہ بات کہاں سے شروع کرے اور ذرا ذرا سی باتیں بھی سُنائے۔

اُس نے بتایا کہ عبدالمجید اُس کا چچا زاد بھائی ہے۔ وہ لوگ ساتھ والے ضلعے کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہاں اُن کی ایک اور خاندان کے ساتھ دشمنی پیدا ہو گئی۔ لڑائیاں ہوئیں۔ پولیس تک بھی معاملہ گیا۔ مقدمے بھی چلے اور لڑائیاں پھر بھی جاری رہیں۔ عبدالمجید کے باپ نے دشمن خاندان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور ان لوگوں کو بھی جن کے گھر ہم بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگا کہ راضی نامہ کر لو۔ یہ لوگ راضی نہ ہوئے۔ آخر یہ لوگ تنگ آ کر وہاں سے یہاں آ گئے جہاں اب آباد تھے۔ یہ کوئی تیس سال پہلے کا واقعہ تھا۔ اُس وقت عبدالمجید کی عمر پانچ چھ سال تھی۔ وہ بڑا ہوا تو ایک روز اِن لوگوں کے ہاں آیا اور انہیں کہا کہ وہ ان کی رشتہ داری کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ یہ بوڑھا جو ہمارے سامنے بیٹھا تھا، عبدالمجید کا چچا تھا۔ عبدالمجید کا باپ مر چکا تھا۔

اس کے بعد عبدالمجید ان کے ہاں آتا رہا۔ اُس نے اپنا آبائی پیشہ ترک کر دیا اور کسی مولوی کا شاگرد بن گیا۔ ان لوگوں کا ذریعۂ معاش کاشتکاری تھا۔ عبدالمجید

نے یہ ذریعہ چھوڑا تو گھر میں فاقے ہونے لگے۔ اس کا چھوٹا بھائی بڑا ہوا تو وہ لوگوں کی کھیتی باڑی کرنے لگا۔ عبدالمجید اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ آخر اُس نے ایک گاؤں کی مسجد سنبھال لی۔ اس شخص میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ اس کی عادتیں بھی بُری نہیں تھیں۔ اُس نے غلطی صرف یہ کی کہ اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔

پھر اُس کی شادی ہو گئی۔ چار سال تک ایک بھی بچّہ پیدا نہ ہُوا۔ پانچویں سال اُس کی بیوی لاپتہ ہو گئی۔ وہ اُسے ڈھونڈتا رہا مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ ایک سال بعد اُسے کسی نے بتایا کہ اس نے اُس کی بیوی کو جہلم میں کہیں دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی تھا جس نے بڑے اچھے کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ خوبصورت جوان تھا۔ عبدالمجید کا دماغ خراب ہو گیا۔ وہ جہلم چلا گیا اور اُس نے اپنی بیوی کی تلاش میں دو سال گذار دیے۔ وہ جب واپس آیا تو اُس کی حالت فقیروں جیسی تھی۔ سائیں ملنگ بنا ہُوا تھا۔

اس حالت میں وہ خانقاہوں، مزاروں اور پیروں کے گھروں میں ماتھا رگڑتا اور یا علی حیدر کے نعرے لگاتا رہا۔ اب کوئی ایک سال سے اُس کی حالت سنوری ہوئی تھی۔ اُس نے پھر مسجدوں میں وقت گذارنا شروع کر دیا اور اُس کا دماغ ٹھکانے آ گیا۔ اُس کا دراصل دماغی توازن بگڑ گیا تھا جو اپنے آپ ہی ٹھیک ہو گیا۔

ایک روز وہ اس گاؤں میں اپنے چچا کے ہاں آیا۔ اُس نے صاف سُتھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی تھی۔ چچا سے اُس نے کہا کہ وہ کسی مسجد کی تلاش میں ہے جہاں وہ اللہ سے دل لگا کر ساری عمر اس مسجد میں

گزار دے گا۔ وہ دو تین روز چچا کے گھر ٹھہرا پھر آگے چلا گیا۔

عورت کہتی تھی "دھوکہ ہُوا ہے"

"اب کوئی چار پانچ روز پہلے کا واقعہ ہے کہ وہ آدھی رات کے بعد آیا" ——
مقتول کے چچا زاد بھائی نے سُنایا —— "اُس کے ساتھ ایک جوان عورت تھی۔ کپڑوں اور زیورات سے اور شکل و صورت سے وہ کسی امیر گھر کی عورت لگتی تھی۔ مجیدے نے بتایا کہ یہ اُس کی بیوی ہے۔ اسے طلاق ہو چکی ہے۔ عورت کہنے لگی کہ اُس نے اُسے دھوکے سے بیوی بنا لیا ہے اور وہ اُس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ ہم نے مجیدے سے کہا کہ اسے جہاں سے لائے ہو وہیں چھوڑ آؤ، ورنہ ہم سب کو پھنساؤ گے۔ اُس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور ہمیں دکھا کر کہا کہ یہ نکاح نامہ ہے۔ گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا ہے تو اُسے دکھالو۔ ہم نے اس کاغذ پر ایک ہی چیز پہچانی۔ یہ ایک انگوٹھا تھا جو عورت کا تھا...

"ہم نے عورت سے پوچھا کہ مجیدے نے اُس کے ساتھ نکاح پڑھایا ہے یا نہیں۔ عورت نے کہا کہ نکاح ضرور ہُوا ہے لیکن اسے چاہیئے کہ مجھے طلاق دے دے۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ ہم یہ سمجھے کہ اس عورت کو مجیدے نے سبز باغ دکھائے ہوں گے اور بتایا ہو گا کہ وہ بہت امیر آدمی ہے۔ اس عورت نے ہاں کر دی ہو گی۔ اب گاؤں میں آ کر اس پر حقیقت کھلی ہے۔ مجیدے نے عورت کو دھمکی دی کہ وہ چپ نہ ہوئی تو وہ اُسے قتل کر دے گا۔ عورت چپ ہو گئی۔ مجیدے نے

ہمیں بتایا کہ اس عورت کو خاوند نے اس لیے طلاق دی تھی کہ اس کے چال چلن پر شبہ تھا اور مجیدے کو خواب میں اشارہ ملا تھا کہ اس عورت سے بھولے بھٹکے ایک گناہ ہو گیا ہے، تم اس کے ساتھ شادی کر لو اور اسے اور زیادہ گناہوں سے بچا لو، ورنہ خاوند سے آزاد ہو کر یہ گناہگار ہو جائے گی....

"مجیدے نے ہمیں بتایا کہ اُس نے اس کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں نکاح کیا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں ہُوا۔ وہ کہتا تھا کہ تم لوگ اس راز کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس عورت پر شیطان کا قبضہ ہو گیا ہے۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اسے شیطان سے آزاد کراؤں....

"حضور! ہم ان پڑھ اور گنوار لوگ ہیں۔ ہم اس کی بات مان گئے۔ وہ حدیث اور قرآن پاک کی باتیں کرتا تھا۔ عورت کو اُس نے ساتھ والے کمرے میں بٹھا دیا۔ وہ روتی تھی۔ مجیدے نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ بہت دیر بعد باہر نکلا۔ اس کے بعد عورت کچھ نہ بولی....

"دوسرے دن پچھلے پہر شہر کا ایک آدمی آپ کی طرح مولوی عبدالمجید کو پوچھتا ہمارے گھر آیا۔ مجیدا گھر تھا۔ وہ آدمی اُسے باہر لے گیا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ مجیدا بہت دیر بعد آیا۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ یہ آدمی کون تھا۔ اُس نے بتایا کہ یہ شہر (قصبے) کا ایک نیک اور پارسا آدمی تھا۔ مجھ سے پوچھنے آیا تھا کہ یہ عورت تمہیں پریشان تو نہیں کر رہی۔ اس کے ساتھ میرا نکاح اسی آدمی نے پڑھایا تھا۔ اس نے بھی مجھے کہا تھا کہ اس عورت کی زندگی سنوار دو۔ یہ جوان ہے اور کوئی آدمی اسے قبول کرنے کو تیار نہیں کیونکہ اس پر تہمت لگی ہے۔ اگر اس کی

دوسری شادی نہ ہوئی تو یہ گناہگار ہو جائے گی....

"ہم نے مجیدے کی یہ بات بھی مان لی۔ اس سے اگلے دن یہی آدمی ایک اور آدمی کو ساتھ لے کر آیا اور وہ مجیدے کو باہر لے گئے۔ مجید بہت دیر بعد واپس آیا اور اس نے وہی بات سنائی جو ایک روز پہلے سنائی تھی۔ اب ہمیں کچھ شک ہوا۔ عورت سے میری ماں اور بہن نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ عورت کو مجیدے نے شاید ڈرا دیا تھا۔ وہ روتی تھی اور اصل بات نہیں بتاتی تھی۔ اتنا ہی کہتی تھی کہ اُس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور وہ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی....

"میرے باپ (مقتول کے چچا) نے اور میں نے مجیدے سے کہا کہ وہ سچ بات بتا دے۔ ہم اب ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ شہر کے معزز آدمی اُس کے پاس یہ پوچھنے آتے ہیں کہ عورت اُسے پریشان تو نہیں کر رہی۔ کیا شہر میں مجیدے سے بہتر کوئی اور آدمی نہیں تھا؟ مجیدے نے وہی بات دُہرائی جو وہ پہلے کہہ چکا تھا۔ ہم نے اُسے کہا کہ وہ عورت کو واپس شہر لے جائے یا اپنے گاؤں لے جائے ... ہم غریب لوگ ہیں حضور! ہم ڈرتے تھے کہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ ہمیں پکا شک ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ مجید اکمرے کا دروازہ بند کر کے اس عورت کے پاس بیٹھا رہتا تھا....

"اس سے اگلے دن کی شام کا واقعہ ہے کہ دو آدمی آئے۔ وہ بھی مجیدے کو باہر لے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ مجیدے کے ساتھ واپس آئے اور مجید انہیں اس کمرے میں لے گیا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اُن میں کیا باتیں ہوتی رہیں۔ میرے باپ نے مجیدے کو باہر بلایا اور کہا کہ اب ہم اُسے اور اس عورت کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے اور

وہ ابھی یہاں سے نکل جائے۔ دراصل جی! اب گاؤں کے لوگ بھی ہم سے پُوچھنے لگے تھے کہ تمہارے گھر یہ اجنبی لوگ کیوں آتے ہیں اور یہ عورت کون ہے؟ آپ خود سب کچھ سمجھتے ہیں جی، لوگوں کو کچھ اور شک ہونے لگا تھا۔ ہم نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ گاؤں کے بڑے ہم پر کوئی اُلٹا سیدھا الزام لگا بیٹھیں اور ہمارے لیے جواب دینا مشکل ہو جائے، ہم اس عورت کو ہی چلتا کر دیں....

"ہم نے مجیدے کو مجبور کر دیا کہ وہ اس عورت کو لے کر یہاں سے چلا جائے، ورنہ ہم گاؤں کے بڑوں کو بلا کر اُسے اور عورت کو ان کے سامنے کھڑا کر دیں گے۔ وہ کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ ان دو آدمیوں اور عورت کے ساتھ چلا گیا۔ آج آپ آ گئے ہیں۔ میں نے جو کچھ بتایا ہے بالکل سچ بتایا ہے۔ ہم یہ باتیں مجیدے کے سامنے بیٹھ کر بھی کہیں گے۔ ہم پر آپ کوئی شک نہ کریں۔"

میں نے اور یعقوب علی نے اُس سے اور اُس کے باپ سے کچھ اور باتیں پوچھیں۔ ان کی عورتوں سے اُس عورت کے متعلق بہت کچھ پوچھا۔ وہ عورت یقیناً رحمت بی بی تھی۔ اُس نے اِن عورتوں کو نہیں بتایا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ مقتول سے ڈری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے یہ شک تھا کہ قاتل یہی لوگ ہو سکتے ہیں۔ میں نے اس شک کے پیش نظر ان پر بہت جرح کی۔ وہ بہت پریشان ہوئے۔ بوڑھے کے آنسو نکل آئے۔

ہم انہیں یہ بتائے بغیر کہ اُن کا مجیدا قتل ہو گیا ہے، وہاں سے آ گئے۔ اب ہم مایوس نہیں تھے۔ پردے اٹھنے لگے تھے۔ مجھے بڑا اچھا شغل مل گیا تھا اور میرا نشہ پورا ہو رہا تھا۔

بیوی کو کسی غیبی چیز نے غائب کر دیا

اللہ مشکلیں آسان کر دیا کرتا ہے۔ ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ پہلا آدمی جو مقتول کے پاس اس گاؤں میں گیا تھا وہ خواجہ امین تھا۔ اس کا گواہ ایک نمبردار تھا۔ میں یہ سمجھا کہ خواجہ امین نے اس عورت کا نکاح مقتول کے ساتھ زبردستی پڑھایا ہے۔ یعقوب علی کہتا تھا کہ مقتول نے سب کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ ہم تھانے میں پہنچے تو خدا نے ہمارے لیے وہاں ایک اور روشنی پہنچا رکھی تھی۔ یہ روشنی ہمیں تھانے کے مخبری اور جاسوسی کے نظام کے ذریعے ملی تھی۔

ایک "معزز مخبر" ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُس سے پوچھا کہ وہ کیا خبر لایا ہے۔ اُس نے کوئی اہم بات نہ سُنائی۔ اُس کی لائی ہوئی خبر ہمارے کسی کام کی نہیں تھی۔ ہم گاؤں سے جو کچھ سُن کر آئے تھے، اس کی روشنی میں اس آدمی سے خواجہ امین کے متعلق کچھ معلوم کرنا ضروری سمجھا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ خواجہ امین خواہ کیسا ہی نیک آدمی ہو، اگر قتل میں اُس کا ہاتھ نہیں تو رحمت بی بی کے نکاح کے ساتھ اُس کا گہرا تعلق ہے۔ وہ مقتول کے پیچھے کیوں گیا تھا؟ اُسے باہر کیوں لے گیا تھا؟ اس کے ساتھ کیا باتیں کی تھیں؟

میں نے اس معزز مخبر سے پوچھا کہ خواجہ امین کی پرائیوٹ زندگی کے متعلق کیا جانتا ہے۔

اُس نے بتایا کہ خواجہ امین شہر کا سرکردہ آدمی ہے۔ مذہب کے کاموں میں

اور لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں پیش پیش رہتا ہے۔

"کیا وہ اپنے بہنوئی خواجہ اللہ بخش کی طرح مذہب میں ڈوبا ہوا ہے؟" — یعقوب علی نے پوچھا۔

"اتنا نہیں" — اُس نے جواب دیا — "خواجہ امین چالاک اور ہوشیار آدمی ہے۔ وہ جو رنگ چاہے اپنے اُوپر چڑھا لیتا ہے۔ خواجہ اللہ بخش کا اُٹھنا بیٹھنا صرف اپنے جیسے آدمیوں کے ساتھ ہے لیکن خواجہ امین کا دوستانہ شہر کے غنڈوں اور بدمعاشوں کے ساتھ بھی ہے۔"

اس کے ساتھ اس ضمن میں باتیں کرتے کرتے بات ذرا دُور نکل گئی، بلکہ بات خواجہ خاندان کے گھر میں داخل ہو گئی۔ ہمارے اِس مُخبر نے اس خاندان کی مستورات کی تعریف کی۔

"... لیکن اب اس خاندان میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے" — اُس نے کہا۔ اب ہم گپ شپ لگا رہے تھے اس لیے اُس نے یہ بات گپ شپ کے انداز سے سُنائی۔ کہنے لگا — "خواجہ اللہ بخش کی پڑوسی عورتوں نے یہ بات پھیلائی ہے کہ اُس کی بیوی کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی تھی۔ وہ پردہ نشین عورت ہے۔ میں نہیں مانتا وہ اپنی ہوش میں اِدھر اُدھر ہو گئی ہو گی، لیکن لوگوں کو کسی گھر کی ذرا سی بات معلوم ہو جائے تو وہ اُسے بڑا دلچسپ قصہ بنا دیتے ہیں۔"

"کیا قصہ بنایا ہے لوگوں نے؟" — یعقوب علی نے اشتیاق سے پوچھا۔ میرے بھی کان کھڑے ہوئے۔

"خواجہ اللہ بخش کے دو بچے چھوٹے ہیں" — اُس نے کہا — "ایک صبح

تین چار دن ہوئے، دونوں بچے رو رہے تھے اور بے بے، بے بے پکار رہے تھے۔ وہ ماں کو بے بے کہتے ہیں۔ ایک پڑوسی عورت کسی کام سے اُن کے گھر میں گئی۔ خواجہ اللہ بخش بچوں کو بہلا رہا تھا اور بہت پریشان تھا۔ اس عورت نے اس سے پوچھا کہ ان کی ماں کہاں ہے۔ خواجہ نے بتایا کہ اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہے، ابھی آ جائے گی۔ یہ عورت واپس آ گئی۔ بچوں کی ماں نہ آئی۔ خواجہ اللہ بخش اپنے کام پر بھی نہ گیا۔ اس کے سسرال دوسرے محلے میں ہیں....

وہی عورت بچوں کے رونے کی آواز پر پھر وہاں چلی گئی اور خواجہ اللہ بخش سے کہا کہ کیسی ماں ہے کہ بچوں کو روتا چھوڑ گئی ہے۔ انہیں ساتھ لے جاتی۔ اُس نے خواجہ سے کہا کہ وہ اُسے بلا لاتی ہے۔ خواجہ نے اُسے کہا کہ وہ نہ جائے، ابھی آ جائے گی، لیکن اس عورت نے پڑوس کا حق ادا کرنا ضروری سمجھا۔ خواجہ اللہ بخش کے روکنے کے باوجود وہ اُس کے سسرال چلی گئی۔ اُس کی زبانی یہ بات سب کو معلوم ہوئی۔ بچوں کی ماں اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئی تھی۔ اس عورت نے وہاں بتایا کہ اُس کے بچے رو رہے ہیں اور وہ معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے....

ڈیڑھ دن گذر گیا۔ بچوں کی ماں نہ آئی۔ پھر کوئی اور عورت اس کے گھر گئی تو اُسے بھی اللہ بخش نے یہی بتایا کہ اُن کی ماں اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہے، ابھی آ جائے گی۔ شاید یہ عورت بھی خواجہ کے سسرال چلی گئی۔ ہوا یوں کہ خواجہ کی ساس آ گئی۔ خواجہ کا ایک بیٹا دس گیارہ سال کا ہے۔ اُس نے اپنی نانی کو بتایا کہ بے بے تو رات کو ہی کہیں چلی گئی تھی، پھر وہ سو گیا تھا، معلوم نہیں واپس آئی تھی یا نہیں۔ یہاں سے معاملہ خراب ہو گیا۔ اتنی لمبی غیر حاضری بڑی عجیب تھی۔ خواجہ اللہ بخش کوئی تسلی بخش

جواب نہ دے سکا۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ خواجہ امین بھی آگیا۔ اب لوگ تماشائی بن گئے مگر کسی کو پتہ نہ چلا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ آخر وہ کل رات واپس آئی ہے۔ عورتوں کو اُس نے بتایا ہے کہ جانے وہ کیسا شر شرار تھا کہ اُسے اُٹھا کر لے گیا۔ اُسے کچھ یاد نہیں کہ وہ کہاں رہی۔ وہ جب گھر آئی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ گھر میں ہے۔ لوگ اسی بات کو سچ مانتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ خواجہ اللہ بخش کوئی وظیفہ کر رہا تھا جس میں اس سے بد پرہیزی ہوگئی۔ یہ اس وظیفے کا اُلٹا اثر ہے کہ اُس کی بیوی کو کسی غیبی چیز نے غائب کر دیا ہے۔"

وہ کچھ چھپا رہا تھا

یہ شخص چلا گیا تو میں نے یعقوب علی سے کہا کہ میرا خیال ہے کہ ہم اس غیبی چیز کو جانتے ہیں جس نے تمہاری رحمت بی بی عمر تیس سال کو غائب کیا تھا۔

"اگر ایسا ہی ہے تو یہ میری سروس کا بڑا ہی عجیب و غریب بلکہ ہر کسی کو حیران کر دینے والا کیس ہوگا"۔ یعقوب علی نے کہا۔ "اس خاندان کی کسی عورت کو شر شرار ہی گھر سے لے جا سکتا ہے۔"

اب خواجہ امین کو تھانے بلانے کا ہمارے پاس معقول جواز آگیا تھا۔ اُسے بُلانے کے لیے ایک بغیر وردی کانسٹیبل بھیجا۔ وہ فوراً آگیا۔ اُس کے ساتھ یعقوب علی نے میرا تعارف یہ کرایا کہ میں سی۔ آئی۔ اے کا انسپکٹر ہوں اور مجھے خاص طور پر مولوی عبدالمجید کے قتل کی تفتیش کے لیے بُلایا گیا ہے۔ اس ملاقات میں سی۔ آئی۔ اے

کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ لوگ سی۔ آئی۔ ڈی کو جانتے تھے لیکن اسے "خفیہ پولیس" کہا کرتے تھے، اس لیے یعقوب علی نے سی۔ آئی۔ اے کی بجائے خفیہ پولیس کہا تھا۔ اس علاقے کے لوگ خفیہ پولیس کو شر شرار سمجھا کرتے اور اس سے ڈرتے تھے۔ میں ہندوستان کے جن علاقوں میں سروس کر آیا تھا وہاں کے جرائم پیشہ لوگ سی۔ آئی۔ اے سے بڑی اچھی طرح واقف تھے۔

میں خواجہ امین کو پہلی بار دیکھ رہا تھا اس لیے میں جان نہ سکا کہ اس کا چہرہ ہنشاش بشاش رہنے والا ہے یا اسی طرح گھبرایا گھبرایا رہتا ہے۔ بہرحال اُس کے چہرے پر جو تأثر تھا وہ گھبراہٹ کا تھا۔ میں نے اُس کی گھبراہٹ دُور کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی۔ میری نظر میں وہ مجرم تھا، خواہ اعانتِ جرم کا ہو۔ قتل کے ساتھ اُس کا تعلق ضرور تھا۔

"خواجہ صاحب!" — میں نے اُسے کہا — "مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ شہر کے معزز آدمی ہیں اور مذہب کے ساتھ آپ کو دلی لگاؤ ہے۔ میں آپ سے اُمید رکھوں گا کہ آپ غلط بیانی نہیں کریں گے۔ اپنی عزت کا خاص خیال رکھیں۔ میں آپ کی عزت بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

میں اُس کے چہرے کو بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ نمایاں طور پر بدل رہا تھا جیسے صاف آسمان پر دُھند چھا رہی ہو۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے جو شدید گھبراہٹ کی نشانی ہوتی ہے۔

"آپ کی زیادہ تر دلچسپیاں کس مسجد سے ہیں؟"

"جامع مسجد سے" — اُس نے کہا اور اس مسجد کے لیے وہ جو کچھ کرتا تھا،

اس کی اُس نے بڑی لمبی روئیداد سُنانی شروع کر دی۔ اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھ پر یہ تاثر پیدا کر رہا ہے کہ وہ سمت مذہبی انسان ہے اور اللہ کے گھر کا شیدائی۔

"مولوی عبدالمجید کی مسجد کے ساتھ آپ کی کیا دلچسپی تھی؟" ــ میں نے پوچھا ــ "کیا یہ مسجد آپ کی سرپرستی میں ہے؟"

اُس کی زبان ہکلا گئی۔ کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور گھونٹ سا نگل کر کہنے لگا ــ "میں اس مسجد میں کبھی نہیں گیا۔ میرے گھر کے قریب ایک مسجد ہے۔ اس میں نماز پڑھنے جایا کرتا ہوں۔ جمعہ جامع مسجد میں پڑھتا ہوں۔"

"سُنا ہے مولوی عبدالمجید کسی وجہ سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا" ــ میں نے کہا ــ "اور آپ اُسے واپس لانے کے لیے اُس کے گاؤں گئے تھے؟"

"ہاں۔ ہاں" ــ وہ ہاں ہاں کہہ کر چُپ ہو گیا، پھر اُس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اُس کی آنکھیں اِدھر اُدھر دیکھ کر مجھ پر جم گئیں۔

مَیں نے اُسے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ میری نظروں کا سامنا نہ کر سکا۔ اُس نے نظریں جُھکا لیں پھر یعقوب علی کی طرف دیکھا۔

"خواجہ صاحب!" ــ یعقوب علی نے کہا ــ "آپ تو اس طرح گھبرا گئے ہیں جیسے میری اور آپ کی پہلی ملاقات ہوئی ہو۔ آپ پہلی بار تھانے میں نہیں آئے۔ خدانخواستہ آپ مجرم تو نہیں۔ اِن سے نہ ڈریں۔ یہ میرے دوست ہیں آپ جانتے ہیں کہ غریب سا مولوی قتل ہو گیا ہے۔ آپ چونکہ اُس کے گاؤں گئے تھے اس لیے آپ سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔ تفتیش میں ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"جی۔ میں گیا تھا"۔ اُس نے کھسیانی سی مسکراہٹ سے کہا "میں وہاں گیا تھا۔ اُسے کہا تھا کہ وہ واپس آجائے۔"

"پھر وہ آگیا تھا؟"

"نہیں آیا"۔ اُس نے جواب دیا۔ "نہیں مانا۔"

"ناراضگی کیا تھی؟"

"اُس نے کچھ بتایا نہیں"۔ اُس نے پہلے سے زیادہ ہکلاتے ہوئے کہا "بس... بس یہی کہتا تھا کہ اب وہاں نہیں جاؤں گا۔"

"آپ اس مسجد میں کبھی نہیں گئے تھے"۔ میں نے کہا۔ "آپ کو کس نے بتایا تھا کہ مولوی عبدالمجید ناراض ہو کر چلا گیا ہے اور اُسے واپس لے آئیں؟"

اب اُس کی گھبراہٹ دیکھنے والی تھی۔ اُس کے ہونٹ ہلتے تھے۔ اندر سے زبان بھی ہلتی ہو گی لیکن اُس کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس کے مُنہ سے نکلا۔ "اوجی! بات یہ ہے کہ... دراصل..."

"خواجہ صاحب!"۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "جواب دینے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ آپ جس کا بھی نام لیں گے کہ اُس نے آپ سے کہا تھا کہ مولوی عبدالمجید کو جا کر واپس لے آئیں، ہم اُس آدمی کو تھانے بلائیں گے اور آپ سے الگ اُس سے آپ کے بیان کی تصدیق کرائیں گے۔ میں آپ کو پھر یاد دلاتا ہوں کہ آپ اس قصبے کے معزز فرد ہیں۔ یہاں کے لوگ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ ہماری مدد کریں کہ ہم آپ کی عزت قائم رکھیں۔ اگر آپ ہمیں وہ بات بتا دیں گے جو آپ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں تو ہم آپ کو حوالات میں بند تو نہیں کر دیں گے۔

ہم انسان ہیں۔ اچھے بُرے کا اُس کی حیثیت کے مطابق خیال رکھتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو وہ خاموشی سے طے ہو سکتی ہے۔ چھپائی جا سکتی ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔"

اُس کے چہرے پر ہلکی سی رونق آگئی۔

"اچھا؟"۔۔۔ اُس نے پوچھا۔۔۔ "بات طے ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں خواجہ صاحب!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "بات تو کریں۔"

میں نے جُرم کرنے والوں میں عمر گذار دی تھی۔ میں گھنٹوں ایسے مجرموں کے ساتھ گفتگو اور جرح کیا کرتا تھا جن کا پیشہ چوری، ڈاکہ اور رہزنی تھا اور ایسے مجرموں کے ساتھ بھی میرا وقت گذرتا تھا جو بھولے بھٹکے یا کسی خاص وجہ سے جُرم کر بیٹھتے تھے۔ ہر مجرم پولیس کی جرح سے گھبرا کر اقبالِ جرم تک آ جاتا ہے لیکن وہ اس طرح پیچھے ہٹ آتا ہے جیسے اُسے کسی نے آگے سے دھکہ دیا ہو۔ وہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگتا ہے۔ اُس وقت اُس کے چہرے پر ایک خاص تاثر ہوتا ہے جسے عقل مند تھانیدار فوراً بھانپ لیتے ہیں۔ میں نے وہ تاثر خواجہ امین کے چہرے پر دیکھا۔ میں ابھی اُسے قاتل نہیں کہہ سکتا تھا لیکن یہ بات صاف تھی کہ وہ کوئی بات جس کا تعلق قتل سے تھا، چھپا رہا تھا۔ اُس نے ایک بار بیکار سی ایک بات کہہ دی۔

بہن کی خاطر سودے پر آگیا

"خواجہ صاحب!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "مجھے اِن سوالوں کے جواب دے دیں

اور تشریف لے جائیں۔ آپ کو کس نے کہا تھا کہ مولوی عبدالمجید ناراض ہو کر چلا گیا ہے اور اُسے واپس لے آئیں؟ پہلے روز آپ گئے تو وہ نہ مانا۔ دوسرے دن آپ جس آدمی کو ساتھ لے گئے تھے، وہ کون تھا؟ اور تیسرے دن آپ نے جن دو آدمیوں کو وہاں بھیجا تھا، وہ کون تھے؟ .... اور سب سے زیادہ ضروری سوال یہ ہے کہ وہ رحمت بی بی کون ہے جس کے ساتھ مولوی عبدالمجید نے نکاح پڑھایا تھا؟ یہ خیال رکھیں کہ ہم آپ کو سوچنے کے لیے کوئی وقت نہیں دیں گے اور جب تک آپ ان سوالوں کے صحیح جواب نہیں دیں گے آپ تھانے سے باہر نہیں جا سکیں گے۔"

"آپ مجھے یہ اجازت دیں کہ دوسرے روز میں جسے ساتھ لے گیا تھا اُسے اپنے ساتھ لے آؤں"۔ اُس نے کہا۔ "میں فوراً آجاؤں گا۔"

میری ہنسی نکل گئی "خواجہ امین صاحب!"۔ میں نے اُسے کہا ——

"آپ لکڑی کے کسی بیوپاری کے ساتھ بات نہیں کر رہے۔ آپ کے سامنے دو تھانیدار بیٹھے ہیں۔"

یہ تو اب واضح ہو چکا تھا کہ اس شخص کا جُرم کے ساتھ تعلق ہے۔ اگر وہ ذرا سا بھی چالاک اور ہوشیار ہوتا تو کہہ سکتا تھا کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں لیکن وہ فطرت کے لحاظ سے مجرم نہیں تھا۔ وہ صرف ہکلا رہا تھا اور گھبرا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کے پاؤں کے نیچے سے ساری زمین کھینچ لی جائے۔ مجھے یہ شک نہیں تھا کہ جس رحمت بی بی کے ساتھ مقتول کا نکاح ہُوا تھا وہ خواجہ امین کی بہن یعنی خواجہ اللہ بخش کی بیوی تھی۔ خواجہ اللہ بخش زندہ وسلامت تھا۔ اُس نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی تھی۔ اُس کا نکاح مقتول کے ساتھ کس طرح ہو سکتا تھا۔

مجھے ایک اور شک ہو رہا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ خواجہ اللہ بخش مذہبی آدمی تھا تو اُس کی بیوی بھی ایسی ہی ہو۔ پولیس اچھی طرح جانتی ہے کہ انسان کیسے کیسے حیران کُن جرائم کیا کرتے ہیں۔ کسی جرائم پیشہ آدمی کی بیوی کا نیک پاک ہونا اور کسی پارسا کی بیوی کا بدچلن ہونا کوئی عجوبہ نہیں۔ میں نے ایسے کئی کیس دیکھے تھے۔ یہ نکاح مجھے فراڈ لگتا تھا جو مقتول نے کیا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ خواجہ اللہ بخش کی بیوی مقتول کے ساتھ چلی گئی ہو۔ اُس کے غائب ہو جانے کی شہادت تو مل ہی گئی تھی۔ وہ اُس رات واپس آئی جس رات مولوی عبدالمجید قتل ہُوا تھا۔ اُس کا کھرا قصبے سے جا نہیں رہا تھا، دیہات سے آ رہا تھا۔

"خواجہ صاحب!" — میں نے پوچھا — "آپ کی بہن کا نام رحمت بی بی ہے نا؟ وہ جو خواجہ اللہ بخش کی بیوی ہے؟... وہ کہاں غائب ہو گئی تھی؟"

میں نے اُس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اُس کا رنگ لاش کی طرح پھیکا سفید ہو گیا۔ اُس نے پھر بھی سنبھلنے کی کوشش کی اور ہکلا کر بولا — "وہ تو جی، کوئی شر شرار تھا۔ ہم نے ...."

"خواجہ صاحب!" — میں اب تھانیداروں کے لہجے میں بولا — "مجھے بہت پہلے پتہ چل چکا تھا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں اور ہمیں چکر دے رہے ہیں۔ کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ ہم نے بہت کچھ معلوم کر کے آپ کو بلایا ہے؟ کیا آپ کو اپنی عزت کا کوئی خیال نہیں؟" — میں اُٹھ کھڑا ہُوا اور یعقوب علی سے کہا — "یعقوب! ایک کانسٹیبل کو خواجہ اللہ بخش کے گھر بھیجو جو اُس کی بیوی کو تھانے لے آئے۔"

خواجہ امین پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ پھر یک لخت وہ بیدار ہو گیا۔ اُس

نے روکنے کے انداز سے دونوں ہاتھ میرے آگے کر دیے اور ہڑبڑا کر بولا "ذرا بیٹھئے۔ میری ایک عرض سن لیں.... آپ نے کہا تھا کہ معاملہ نہیں طے ہو سکتا ہے"

"میں اب بھی یہی کہتا ہوں" — یعقوب علی نے کہا "لیکن آپ وہ بات تو بتائیں جس کا معاملہ طے کرنا ہے۔"

"آپ جانتے ہیں خدا نے مجھے بہت دیا ہے" — اس نے کہا "اس میں سے کچھ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں تو مجھے خوشی ہو گی۔ آپ خود حکم کریں۔ جو کہیں گے پیش کر دوں گا۔"

"ہمیں سودا منظور ہے" — میں نے کہا "لیکن یہ تو پتہ چلے کہ اصل بات کیا ہے۔ تھانوں میں کیا نہیں ہوتا۔ یہاں تو قتل بھی گول ہو جاتے ہیں۔ آپ ہمیں ساری بات بتا دیں تاکہ ہم آپ کے لیے اور اپنے لیے کوئی راستہ نکالیں۔ آپ درخت دیکھ کر سودا کیا کرتے ہیں نا!"

وہ جنّ تھے

"آپ پکا وعدہ کرتے ہیں؟" — اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"خواجہ صاحب!" — میں نے کہا "گھر آئے ہوئے مال کو کون چھوڑتا ہے لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ ہم منہ مانگا مال لیں گے۔ ہم دو ہیں اور اوپر والوں کو بھی کچھ دینا ہے۔"

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "خالی چیک دستخط کر کے دے دوں گا۔

رقم آپ لکھیں گے۔"

"یہ سارا معاملہ عزت کا تھا"۔ اُس نے کہا۔" ایک روز مجھے اطلاع ملی کہ میری بہن کہیں چلی گئی ہے اور بچے رو رہے ہیں۔ پہلے میری والدہ گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو وہ بہت پریشان تھی۔ اُس نے بتایا کہ رحمت بی بی کو بہت سے گھروں میں جا کے دیکھا ہے۔ کہیں بھی نہیں ملی۔ میں گیا۔ میرا بہنوئی خواجہ اللہ بخش بھی بہت پریشان تھا۔ کہتا تھا کہ اُسے کچھ پتہ نہیں رحمت بی بی کہاں ہے۔ وہ اِدھر اُدھر ہُوا تو اُس کا بڑا بچہ جس کی عمر گیارہ بارہ سال ہے، میرے قریب آیا اور اُس نے مجھے بڑی عجیب بات بتائی۔ کہنے لگا کہ رات کو ابّا اور بے بے شاید یہ سمجھتے تھے کہ میں سو گیا ہوں۔ دونوں بیٹھک میں چلے گئے۔ بیٹھک میں کوئی اور بھی تھا میں نے دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ وہاں ایک داڑھی والا آدمی بیٹھا تھا اور دو اور آدمی تھے۔ ان کی بھی داڑھیاں تھیں۔ بے بے ایک کونے میں سر جھکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بے بے تو پردہ کرتی ہے۔ میں حیران ہُوا کہ وہ باہر کے ان آدمیوں کے سامنے کیوں بیٹھی ہے۔ ایک داڑھی والے نے ایک رجسٹر کھولا۔ اس پر کچھ لکھتا رہا۔ پھر اس پر بے بے کا انگوٹھا لگوایا گیا۔ ابّا نے اُس آدمی کو بہت سے پیسے دیئے۔ سب آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے پھر وہ اُٹھے اور بے بے اُن کے ساتھ چلی گئی۔ میں دوڑ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ صبح ابّا سے پوچھا کہ بے بے کہاں گئی ہے۔ ابّا نے کہا کہ ابھی آ جائے گی۔ وہ نہ آئی تو میں نے ابّا سے کہا کہ وہ رات کو اُن آدمیوں کے ساتھ کہاں گئی ہے۔ ابّا نے مجھے یہ کہہ کر ڈرا دیا کہ وہ جن تھے۔ وہ تمہاری بے بے کو لے گئے ہیں۔ آج شام تک واپس لے آئیں گے....

"وہ بچہ تھا۔ ڈر گیا مگر ماں کی جُدائی نے بچے کے دل سے ڈر نکال دیا اور
اُس نے مجھے بتا دیا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں
آ رہی تھی کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے خواجہ اللہ بخش سے پوچھا کہ بچہ کیا کہتا ہے؟
رحمت بی بی کہاں ہے؟ اُس کے آنسو نکل آئے اور بولا۔ "بچہ ٹھیک کہتا ہے لیکن میرے
ساتھ دھوکہ ہو گیا ہے" — یہ دھوکہ سُننے سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ خواجہ
اللہ بخش خبطی اور وہمی آدمی ہے۔ شریعت کا اتنا پابند کہ بیوی بچوں کو بھول جاتا ہے۔
اگر صبح دکان کھولتے پہلے بایاں پاؤں دکان میں چلا جائے تو فوراً پاؤں پیچھے کر لیتا
ہے۔ توبہ استغفار پڑھتا ہے، پھر ایک دُعا پڑھ کر پہلے دایاں پاؤں دکان میں
رکھتا ہے....

"طبیعت کا سخت ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر میری بہن کو ٹوکتا اور ڈانٹتا ہے"
میری بہن کی طبیعت اور عادت کچھ اور ہے۔ خوش طبع عورت ہے۔ خواجہ اللہ بخش
نے مجھے بتایا کہ وہ باہر سے آیا تو رحمت بی بی گھر نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گئی تو
خواجہ اللہ بخش نے بڑے غصّے سے اُسے کہا کہ میں گھر آیا بیٹھا ہوں اور تم شہر میں آوارہ
پھر رہی ہو۔ رحمت بی بی کہاں تھی ایسی تہمت برداشت کرنے والی۔ اُس نے ایک
کی دو سُنائیں اور خواجہ اللہ بخش کی بہنوں کو آوارہ اور بدمعاش کہہ دیا۔ خواجہ اللہ بخش
غصّے کا بہت تیز ہے۔ اُس نے اور زیادہ بکواس کی۔ میاں بیوی میں بڑی سخت
تُو تکار ہو گئی۔ خواجہ اللہ بخش شاید اس حرکت کو غیر شرعی سمجھتا ہو گا کہ بیوی خاوند
کے مُنہ آئے۔ اُس نے کہہ دیا "جا تُو مجھ پر حرام ہے۔ میں نے تمہیں طلاق دی۔ میں
نے تمہیں طلاق دی۔ میں نے تمہیں طلاق دی" — اس طرح اُس نے تین طلاقیں پوری

کر دیں....

"اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خواجہ اللہ بخش کے دل میں میری بہن کی بہت قدر اور محبت ہے۔ اپنے بچوں کے ساتھ تو اُسے محبت ہے ہی۔ رحمت بی بی نے طلاق قبول کر کے اپنا سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا اور بچوں سے کہا کہ چلو نانا نانی کے گھر چلیں۔ خواجہ صاحب کا غصہ بالکل بجھ گیا اور اُس نے رحمت بی بی سے کہا کہ مجھے معاف کر دو۔ رحمت بی بی طلاق سے خوش تو نہیں تھی، وہ رُک گئی مگر خواجہ اللہ بخش شریعت کا پابند ہے۔ اُس نے رحمت بی بی سے کہا کہ وہ اُسے تین طلاق دے چکا ہے۔ لہٰذا اب وہ اُس پر حرام ہے۔ اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے اوپر حلال کرنے کا شرعی طریقہ ہے حلالہ۔ چنانچہ اُس نے حلالہ کرانا ضروری سمجھا۔"

ایک رات کا خاوند

میں نے شرعی قوانین و ضوابط کا گہرا مطالعہ نہیں کیا اس لیے شریعت کی اصطلاحوں میں بات نہیں کر سکتا۔ چند ایک موٹے موٹے اور روزمرہ کے استعمال کے شرعی قانون جانتا ہوں۔ حلالہ ایک شرعی طریقۂ کار ہے۔ شہروں میں اس سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔ دیہات میں اس سے ہر کوئی آگاہ ہے۔ اس کا استعمال اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے دے لیکن اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ اسی عورت کو بیوی بنانا چاہے۔ اس کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ اس عورت کا نکاح کسی اور آدمی کے ساتھ پڑھا جائے اور یہ عورت صرف ایک رات

کے لیے اُس کی بیوی رہے گی۔ اگلی صبح یہ آدمی اُسے طلاق دے گا اور اُس کا خاوند اُس کے ساتھ نکاح پڑھالے گا۔ اسے حلالہ کرانا کہتے ہیں۔

دیہات میں اکثر یوں ہوتا ہے کہ کوئی خاوند غصے میں آکر اپنی بیوی کو ایک دو تین طلاق کہہ دیتا ہے لیکن خواجہ اللہ بخش کی طرح اُسے غصہ اُترتے ہی پچھتاوا ہوتا ہے مگر شریعت کی رُو سے بیوی اُس پر حرام ہو چکی ہوتی ہے۔ لہٰذا حلالہ ضروری ہوتا ہے۔ دیہات میں پیشہ ور حلالہ کرنے والے بھی مل جاتے ہیں جو اصل خاوند سے کچھ رقم لے کر صرف کاغذی خاوند بنتے ہیں عملاً نہیں اور ایسی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں کہ حلالہ کرانے کی خاطر اپنی مطلقہ بیوی کو کسی "رضاکار" کے ساتھ ایک رات کے لیے بیاہ دیا گیا اور اگلے روز اُس نے طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ بعض اوقات اس میں ایک رات کے میاں بیوی کی مرضی شامل ہو جاتی ہے۔ بیوی کہہ دیتی ہے کہ وہ اب اسی کی بیوی رہے گی۔ اُس سے بیوی نہیں چھڑائی جا سکتی کیونکہ نکاح باقاعدہ پڑھا جاتا ہے اور نکاح کی کاغذی کارروائی مکمل ہوتی ہے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے "رضاکار" خاوند کو خاصی رقم دی جاتی ہے اور اس کے نیے رقم الگ دی جاتی ہے کہ وہ صرف کاغذی خاوند رہے۔ دیہات میں مسجدوں کے بعض مولوی ایک رات کا کاغذی خاوند بننے کا پیشہ کرتے ہیں۔

خواجہ امین کا بہنوئی خواجہ اللہ بخش بڑی سختی سے شریعت پرست تھا۔ اسی سختی سے اُس نے بیوی اپنے اوپر حرام قرار دے دی اور اسی شدت سے اُس نے محسوس کیا کہ وہ اس بیوی (رحمت بی بی) کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خواجہ امین نے اپنے بیان میں کہا کہ خواجہ اللہ بخش نے اُسے بتایا کہ اُس نے حلالہ کے لیے کسی موزوں

اور قابلِ اعتماد آدمی کی تلاش شروع کی۔ اس نے ایک دوست سے بات کی۔ دوست بھی شریعت کا پابند تھا۔ اُس نے خواجہ اللہ بخش سے کہا کہ حلالہ واقعی لازمی ہے۔ اس دوست نے عبدالمجید مقتول کو موزوں آدمی سمجھا کیونکہ وہ چُپ چاپ اور مرا مِٹا سا آدمی تھا۔

مقتول کے ساتھ بات ہوئی۔ اُسے کہا گیا کہ اُسے ایک سَو روپیہ حلالہ کی فیس دی جائے گی اور دو سَو روپیہ اس کی فیس کہ وہ کاغذی خاوند رہے اور بیوی کے جسم سے دُور رہے۔ عبدالمجید نے اس پابندی کی تین سو فیس مانگی لیکن اڑھائی سَو روپے پر سودا ہو گیا۔ اُن دنوں ساڑھے تین سَو روپیہ بہت بڑی رقم ہُوا کرتی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ مقتول کی جیب سے تین سو پچپن روپیہ برآمد ہُوا تھا۔ اُس نے ساڑھے تین سَو روپیہ وصول کیا تھا۔ اُسے اگلی صبح روشنی سے پہلے رحمت بی بی کو طلاق دے کر خواجہ اللہ بخش کے گھر بھیج دینا تھا۔

خواجہ اللہ بخش نے خواجہ امین کو بتایا کہ نکاح خواں کی ضرورت تھی۔ مولوی عبدالمجید نے کہا کہ چونکہ وہ خود نکاح پڑھا سکتا ہے اس لیے کسی اور نکاح خواں کی ضرورت نہیں۔ خواجہ اللہ بخش نے یہ اس لیے تسلیم کر لیا کہ نکاح درپردہ پڑھنا تھا اور ساری کارروائی خفیہ رکھنی تھی۔ چنانچہ دو گواہ جو خواجہ اللہ بخش کے دوست اور ہم خیال تھے، شام کے بعد خواجہ کے گھر بُلائے گئے۔ رحمت بی بی کو بیٹھک میں بٹھا دیا گیا اور اُسے شریعت کا حکم سمجھا کر نکاح پڑھا دیا گیا۔

رحمت بی بی کی مولوی عبدالمجید کے ساتھ رخصتی بھی لازمی تھی۔ چنانچہ مولوی عبدالمجید رحمت بی بی کو ساتھ لے گیا۔

مولوی صاحب ولی معلوم ہوتے ہیں

صبح کی اذان کے وقت، خواجہ اللہ بخش عبدالمجید کے گھر اپنی بیوی کو اُس سے طلاق دلوانے اور واپس لانے گیا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ اس کے بعد نہ عبدالمجید نظر آیا نہ رحمت بی بی۔ خواجہ اللہ بخش کے لیے بڑی اذیت ناک مشکل پیدا ہوگئی۔ وہ پولیس کو رپورٹ دینے سے ڈرتا تھا۔ رحمت بی بی اب قانونی طور پر عبدالمجید کی بیوی تھی۔ گھر میں اُسے بچے پریشان کرنے لگے۔

"میں نے جب خواجہ اللہ بخش سے یہ واردات سُنی تو مجھے آگ لگ گئی" — خواجہ امین نے بیان دیتے ہوئے کہا — "شریعت اپنی جگہ ہے لیکن جناب! اتنے اُونچے گھر کی عورت کو عبدالمجید جیسا ایک بھکاری لے جائے، بہت بڑی بے غیرتی ہے۔ خواجہ اللہ بخش رو رہا تھا۔ وہ بہت سیدھا آدمی ہے۔ اُس کے ہوش ایسے گم ہوئے کہ اُس نے کسی سے یہ بھی نہ پوچھا کہ مولوی عبدالمجید کہاں کا رہنے والا تھا تاکہ اُس کا تعاقب کیا جاتا۔ وہ ساڑھے تین سو روپیہ بھی لے گیا اور عورت بھی لے گیا تھا۔ شریعت کا تو میں بھی پابند ہوں لیکن میرے تعلقات ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ ہیں....

"میں نے عبدالمجید کے جاننے والوں سے معلوم کر لیا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اُس کے گاؤں کا نام تو معلوم نہ ہو سکا، یہ پتہ چل گیا کہ گاؤں کس طرف ہے۔ میں درخت خریدنے کے لیے بہت سے دیہات میں جاتا رہتا ہوں اس لیے اس علاقے سے

پوری واقفیت ہے۔ میں اُدھر کو چل پڑا۔ راستے میں ایک نمبردار مل گیا۔ اُس سے پوچھا تو اتفاق سے وہ عبدالمجید کو جانتا تھا۔ اُس نے اُس کے رشتہ داروں کا گاؤں بتا دیا۔ وہاں گیا۔ عبدالمجید مل گیا۔ اُسے باہر لے جا کر پوچھا کہ اُس نے طلاق کیوں نہیں دی۔ اُس نے صاف جواب دیا کہ رحمت بی بی اُس کی منکوحہ ہے۔ قانون اور شریعت کے لحاظ سے وہ اُس کی بیوی ہے۔ وہ طلاق نہیں دے گا....

"وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے اُسے پانچ سو روپیہ پیش کیا جو اُس نے قبول نہ کیا۔ اُس نے ایک ہزار روپیہ بھی ٹھکرا دیا اور کہا کہ اُسے پاکستان کا پورا صوبہ دے دو تو بھی وہ اس عورت کو طلاق نہیں دے گا۔ میں واپس آ گیا۔ دوسرے دن ایک آدمی کو ساتھ لے گیا۔ اُس نے بھی عبدالمجید سے بہت کچھ کہا لیکن وہ نہ مانا۔"

خواجہ امین نے اس آدمی کا نام و پتہ بھی بتایا اور اُس کے متعلق یہ رائے دی کہ وہ بہت چالاک اور پتھر کو بھی موم کر دینے والا آدمی ہے مگر وہ اس پتھر کو موم نہ کر سکا۔ اُس نے فوراً دوسرا حربہ استعمال کیا۔ وہ خواجہ امین پر برس پڑا۔ کہنے لگا۔ "میں نے مولوی صاحب کو پہلی بار دیکھا ہے۔ ان کے ماتھے پر آپ نے ستارہ نہیں دیکھا؟ یہ تو پہنچ والی شخصیت ہے اور آپ لوگ انہیں پریشان کر رہے ہیں۔ کیا آپ خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ آپ کی بہن کو یہ خاوند مل گیا ہے جو اگلے جہان تمہارے سارے خاندان کو بہشت میں لے جائے گا؟ ان سے معافی مانگو خواجہ صاحب! یہ مولوی صاحب تو ولی معلوم ہوتے ہیں۔"

خواجہ امین نے ہمیں بتایا کہ اس آدمی نے ایسی کمال کی اداکاری کی کہ

خواجہ امین سمجھتے ہوئے بھی متاثر ہوگیا۔ اُس نے عبدالمجید کو آسمان پر چڑھا دیا۔ اُس کے آنکھ کے اشارے پر خواجہ امین نے جُھک کر مقتول کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور کہا۔"میں آپ کو اپنا بہنوئی تسلیم کرتا ہوں"۔

اس شخص نے جس کا نام خواجہ امین نے عاشق حسین بتایا تھا، خواجہ امین سے کہا "خواجہ صاحب! اللہ کی دی ہوئی بزرگی اور کرامات مولوی صاحب کے پاس ہے اور دولت آپ کے پاس ہے۔ آپ انہیں واپس لے چلیں اور کچھ پیسہ خرچ کر کے ان کا گھر آباد کر دیں۔ ہم انہیں بڑی مسجد کی امامت دلائیں گے"۔

"لیکن خواجہ اللہ بخش میرے پیچھے پڑ جائے گا"۔ عبدالمجید نے کہا۔

"آپ کے پاس نکاح نامہ ہے"۔ خواجہ امین نے کہا "رحمت بی بی کا وارث میں ہوں۔ کوئی آپ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا"۔

معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمجید بڑی کمزور شخصیت کا آدمی تھا جو پھونک میں آ گیا۔ بعد میں جب میں اُس آدمی سے ملا جس نے اُسے رام کیا تھا تو میں مان گیا کہ وہ کسی کا دماغ اپنے قبضے میں لینے کے فن کا ماہر ہے۔

خواجہ امین اور اُس کا دوست مقتول کے گھٹنے چھو کر اور یہ وعدہ لے کر آ گئے کہ وہ بیوی کو لے کر شہر میں آ جائے۔ انہوں نے اُسے کہا کہ کل یا پرسوں شام دو آدمی اُسے لینے آئیں گے۔

اُس کے دن پورے تھے

خواجہ امین اور عاشق حسین جب واپس آ رہے تھے تو عاشق نے خواجہ

سے کہا کہ یہ شخص طلاق نہیں دے گا اور یہ صورت کسی قیمت پر قابلِ قبول نہیں کہ کہ اُس کی بہن اس اُجڈ آدمی کی بیوی بنی رہے۔ اس سے رحمت بی بی کو چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ یہ زندہ نہ رہے۔ اگر اس سے ہم رحمت بی بی کو چھین کر لے گئے تو خواجہ اللہ بخش اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکے گا کیونکہ یہ شخص اُسے طلاق نہیں دے گا۔ اس شخص کا مرنا ضروری ہو گیا ہے۔

قتل کی سکیم بتاتے ہوئے خواجہ امین ڈر گیا۔ ہماری حوصلہ افزائی سے اور اس وعدے سے کہ ہم اُس کے ساتھ معاملہ طے کر لیں گے، اُس نے سب کچھ بتا دیا۔ خواجہ امین کا میل ملاقات ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ تھا اور اُس کے پاس پیسہ بھی تھا۔ عاشق حسین چلتا پُرزہ اور دوسروں کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے والا آدمی تھا۔ قصبے کے ساتھ ہی قبرستان تھا جس میں ملنگوں کا تکیہ تھا۔ ملنگوں کو آپ جانتے ہیں، چرس اور بھنگ پیتے اور ہر جرم کر گذرتے ہیں۔ خواجہ امین نے اپنے دوست کی مدد سے ایک ملنگ کی خدمات حاصل کیں اور اُس کے ساتھ سودا طے کر لیا۔

عاشق حسین بھی مجرمانہ ذہنیت کا آدمی تھا۔ ضرورت دو آدمیوں کی تھی لیکن اس دوست نے خواجہ امین سے کہا کہ کام بڑا خطرناک ہے اس لیے وہ خود ملنگ کے ساتھ جائے گا۔ وہ بظاہر دوستی کا حق ادا کر رہا تھا لیکن اُس نے خواجہ امین کو اپنی ایک مشکل بتائی۔ خواجہ امین سمجھ گیا کہ وہ اُجرت مانگ رہا ہے۔ اس نے اس دوست کو اڑھائی ہزار روپیہ نقد دے دیا۔ یہ اُس وقت کی بہت زیادہ رقم تھی۔ ملنگ کو پانچ سو روپے پیشگی دیے گئے۔ وہ دو بار کا سزا یافتہ تھا اور پولیس کے ریکارڈ پر تھا۔

اگلی شام وہ دونوں مقتول کے گاؤں چلے گئے۔ آدھی رات سے کچھ دیر پہلے وہ واپس آ گئے۔ اُس وقت خواجہ امین، خواجہ اللہ بخش کے گھر بیٹھا تھا۔ وہ بے تابی سے رحمت بی بی اور ان دو آدمیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ اُن کے دم خشک ہو رہے تھے۔ خواجہ امین کے بیان کے مطابق انہیں بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ کامیاب لوٹیں گے۔ خواجہ اللہ بخش تسبیح ہاتھ میں لیے کوئی وِرد وظیفہ کر رہا تھا۔ آخر انتظار ختم ہُوا اور سب سے پہلے رحمت بی بی گھر میں داخل ہوئی۔ اُس نے پہلی سرگوشی یہ کی — "یہ دو آدمی کون ہیں؟ انہوں نے اُسے جان سے مار دیا ہے" — وہ کانپ رہی تھی۔ اُس کے بھائی اور خاوند نے اُسے تسلی دی اور کہا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

عاشق حسین اور ملنگ بیٹھک میں بٹھائے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مقتول کے گاؤں گئے تو وہ جیسے اُن کی انتظار میں تھا۔ عاشق حسین نے اداکاری کا جادو چلایا اور مقتول کو رحمت بی بی کے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ اس چرب زبان شخص نے مقتول سے کہا کہ اُس نے بہت سے سرکردہ افراد اپنے ساتھ ملا لیے ہیں اور اب کوئی خطرہ نہیں۔ اُس نے مقتول کو باتوں میں ولی اور قطب بنا دیا۔

میں وہ تمام باتیں جو اُس نے مقتول کے ساتھ کیں، لکھ نہیں سکتا کیونکہ یہ بڑی لمبی باتیں ہیں۔ آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ سیدھا سادا عبدالمجید اُن کے جھانسے میں آ گیا۔ اس کے لیے ایک مشکل یہ بھی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ چچا کے گھر میں رہتا تھا۔ ان لوگوں نے اُسے کہہ دیا تھا کہ وہ اس عورت کو یہاں سے لے جائے۔ مختصر یہ کہ اُس کے دن پورے ہو چکے تھے۔ اُس کی موت کا ہر سبب آسانی سے کامیاب ہوتا جا رہا تھا۔

اُسے قتل کرنے کا طریقہ یہ سوچا گیا تھا کہ پیچھے سے ملنگ اُس کے گلے میں رسّی

پھینکے گا اور عاشق حسین اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لے گا۔ یہ طریقہ ملنگ نے سوچا تھا۔ مقتول کو قصبے سے بہت دُور پیچھے ختم کرنا تھا لیکن جوں ہی ملنگ رسّی پھینکنے کے لیے پیچھے ہوتا، مقتول اتفاق سے پیچھے دیکھتا یا اِدھر اُدھر ہو جاتا۔ موقع نہ ملنے کی وجہ سے قصبہ قریب آ گیا۔ عاشق حسین نے مزید انتظار بہتر نہ سمجھا۔ اُس نے چلتے چلتے مقتول کے پہلو کی طرف ہو کر اُسے بازوؤں میں اس طرح جکڑ لیا کہ مقتول کے بازو بھی جکڑے گئے۔

"چل اوئے"۔ عاشق حسین نے ملنگ کو للکارا۔

ملنگ تیار تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے رسّی مقتول کے گلے میں ڈالی اور گانٹھ دے کر رسّی کے سرے پورے زور سے کھینچے۔ مقتول کچھ دیر تڑپا۔ ملنگ رسّی کے سرے اور زیادہ کھینچتا رہا۔ مقتول مر گیا۔ عاشق حسین نے اُس کی نبض دیکھی۔ دل پر ہاتھ رکھا۔ وہ مر چکا تھا۔ رحمت بی بی کی چیخ نکل گئی۔ وہ دونوں اُسے گھر لے گئے۔

خواجہ اللہ بخش اور خواجہ امین نے انہیں شاباش دی اور شکریہ ادا کیا۔ دونوں قاتلوں کو اُجرت مل چکی تھی مگر عاشق حسین نے مزید رقم کا مطالبہ کر دیا۔ پانچ سو اپنے لیے اور پانچ سو ملنگ کے لیے۔ خواجہ امین نے اُسے کہا کہ وہ پہلے ہی اتنی زیادہ رقم دے چکا ہے۔ عاشق حسین نے کہا کہ نہ دیں۔ ہم تھانے چلے جاتے ہیں۔ یہ عاشق حسین نے بلیک میلنگ کا پہلا وار کیا تھا۔

خواجگان نے انہیں پانچ پانچ سو روپیہ مزید دے دیا اور دونوں قاتل چلے گئے۔

شب عروسی غیر مرد کے ساتھ

خواجہ امین ہر آدمی کی نشاندہی کرتا چلا جا رہا تھا۔ ان سب کو اُسی روز گرفتار کر لیا گیا۔ خواجہ امین کو بھی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ خواجہ اللہ بخش قتل میں شریک نہیں تھا۔ اُس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ کچھ دیر نیم غشی میں رہتا اور بیدار ہو کر کوئی بات کرتا تھا۔ اُس نے نکاح کے دونوں گواہوں کے نام پتے بتا دیے۔ دونوں کو گواہوں کی فہرست میں رکھا گیا۔ ہم نے سوچ سوچ کر خواجہ اللہ بخش کو بھی گرفتار کر لیا۔

رحمت بی بی بھی گواہ تھی۔ شریف اور باعزت گھرانے کی پردہ نشین عورت کی تو جیسے جان ہی نکلی ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ پہلے ہی زیادتی ہوئی۔ خاوند نے اُسے ایک دو تین طلاق کہہ دیا تھا تو اس میں عورت کا کوئی قصور نہ تھا لیکن سزا اسی کو ملی۔ اُس کا نکاح ایک جانور کی طرح کے آدمی سے پڑھا دیا گیا۔

ہم نے بڑی مشکل سے اُس سے بیان لیا۔ اُسے یقین دلایا گیا تھا کہ یہ شریعت کا حکم پورا کرنے کے لیے محض کاغذی کارروائی ہو رہی ہے اور صبح کی روشنی سے پہلے وہ اپنے گھر آ جائے گی۔ وہ اطمینان سے مقتول کے ساتھ اُس کے گھر چلی گئی۔ وہ پردہ نشین عورت تھی۔ مقتول اس کے لیے غیر مرد تھا۔ اُس نے گھونگھٹ نیچے کیے رکھا مگر مقتول نے اُسے کہا کہ وہ اُس کی شرعی بیوی ہے اور اب اُسی کی بیوی رہے گی۔

رحمت بی بی نے اُسے بتایا کہ اُس کا یہ خیال غلط ہے۔ اگر اُس نے اُسے چھیڑا تو وہ گھر چلی جائے گی۔ مقتول نے اُسے کہا کہ نکاح نامہ اُس کے پاس ہے جس پر اُس

نے انگوٹھا لگایا ہے ۔ وہ اب جہاں بھی چلی جائے گی ، وہ پولیس اور عدالت کے حکم سے اُسے واپس لے آئے گا ۔ رحمت بی بی نے اُس کی منت سماجت کی مگر مقتول پر وحشی پن سوار ہو چکا تھا ۔ رحمت بی بی نے اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی ۔ بستر پر اور فرش پر ہمیں چوڑیوں کے جو اتنے زیادہ ٹکڑے ملے تھے وہ اسی کوشش میں ٹوٹے تھے ۔

مقتول نے وہ چاقو نکال لیا جو اُس کی لاش سے برآمد ہوا تھا ۔ اُس نے رحمت بی بی سے کہا ۔ "میرا دُنیا میں کوئی نہیں ۔ میں تمہیں قتل کر کے پھانسی بھی چڑھ جاؤں گا تو میری نہ بیوی ہے نہ کوئی بچہ جو میرے بغیر بھوکے مر جائیں گے ۔"

پردہ نشین اور شریف عورت کہاں تک مقابلہ کرتی ۔ اُس نے ہمیں بیان دیتے ہوئے کہا تھا ۔ "اُس کی شکل خوفناک ہو گئی تھی اور اُس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا صاف نظر آتا تھا ۔ مجھ پر غشی طاری ہونے لگی ۔"

مقتول نے اُس پر غشی طاری نہ ہونے دی اور رحمت بی بی ہار گئی ۔ چاقو کی نوک پر وہ اُسے شہر سے باہر لے گیا ۔ راستے میں وہ اُسے ڈراتا دھمکاتا رہا کہ اُس نے کسی کو اصل حقیقت بتائی تو وہ اُسے قتل کر دے گا ۔ وہ اُسے اپنے چچا کے گاؤں لے گیا ۔ وہاں وہ اُسے ڈراتا دھمکاتا بھی تھا اور منت سماجت بھی کرتا تھا ۔ وہ بیچاری ڈرتی اصل بات نہیں بتاتی تھی ۔ اتنا ہی کہتی تھی کہ اس کے ساتھ نہیں رہوں گی ۔

یعقوب علی نے کیس تیار کرنے کے لیے مجھے اپنے پاس روکے رکھا ۔ ہم نے بڑی محنت سے کیس تیار کیا ۔ پولیس نے اٹھارہ گواہ پیش کیے تھے ۔ میں اس کیس میں تماشائی تھا ۔ مجسٹریٹ کی عدالت سے کیس سیشن کورٹ میں گیا ۔ بڑا دلچسپ کیس تھا ۔

کتاب کا کور

عامر بلال

رابطہ

فیس بک

https://www.facebook.com/aamiralibilal

ٹویٹر

http://twitter.com/aamirbilal

انسٹاگرام

https://www.instagram.com/aamirbilal

یوٹیوب

https://www.youtube.com/@aamirbilal

سیشن کورٹ نے عاشق حسین، ملنگ اور خواجہ امین کو عمر قید کی سزا دی۔ خواجہ اللہ بخش اور نکاح کے دونوں گواہوں کو ایک ایک سال سزائے قید دی گئی۔ ان کے خلاف یہ الزام تھا کہ انہوں نے سرکاری ریکارڈ (نکاح رجسٹر) میں اپنی مرضی اور مفاد کے مطابق غلط اندراج کیا یعنی نکاح خوان اُسی کو بنایا جس کا نکاح پڑھا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے یہ جُرم کیا کہ رحمت بی بی مطلقہ نہیں بلکہ شادی شدہ تھی کیونکہ عدالت میں تحریری طلاق نامہ پیش نہ کیا گیا۔ زبانی طلاق کو عدالت نے تسلیم نہ کیا۔ پھر انہوں نے ایک جُرم یہ بھی کیا کہ رحمت بی بی کے وارث زندہ تھے۔ اُن سے اُس کے نکاح کی اجازت نہ لی گئی نہ وہ نکاح میں شریک تھے۔

ہائی کورٹ نے اپیلیں مسترد کرتے ہوئے سزائیں بحال رکھیں۔ اس حادثے سے ایک اور حادثہ یہ ہُوا کہ رحمت بی بی اپنے بھائی اور خاوند کی سزائیں سُنتے ہی دماغی توازن کھو بیٹھی۔ ڈیڑھ ایک سال بعد اس قصبے کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ رحمت بی بی کا کچھ پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے۔

دولت، تکبّر اور تیزاب

دولت کا نشہ انسان کو کس طرح بے دین اور بدکار بنا دیتا ہے؟ — میری ایک تفتیش کی روئیداد پڑھیں تو آپ کو جواب مل جائے گا اور یہ روئیداد آپ کو انسانی فطرت کے کچھ اور پہلو بھی دکھائے گی۔ یہ قصّہ بڑا ہی پُرانا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں اس ڈرامے کو پُرانا نہیں ہونے دیا گیا۔

یہ دلّی کا واقعہ ہے۔ وہاں کے ایک محلّے کا کیس سی۔ آئی۔ اے کے سپرد کیا گیا۔ واردات پندرہ سولہ روز پُرانی ہو گئی تھی۔ متعلقہ تھانے کا تھانیدار کوئی سراغ نہیں لگا سکا تھا۔ ایسے اکثر کیس عدم پتہ قرار دے کر فائلوں میں دفن کر دیے جاتے ہیں۔ کوئی خاص کیس سی۔ آئی۔ اے کے سُپرد ہوتے تھے۔ ان "خاص" لوگوں میں وہ بھی شامل تھے جو انگریزی حکومت کے منظورِ نظر تھے۔ اس واردات کا شکار ایک مسلمان امیر زادہ ہُوا تھا۔ میں صحیح نام اور مقام لکھ کر اس خاندان کی نشان دہی نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لیے دِلّی کے اس محلّے کا نام بھی نہیں لکھ رہا۔ جہاں افراد کے نام کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں فرضی نام لکھوں گا۔

واردات یہ تھی کہ ایک امیر کبیر گھرانے کا جواں سال آدمی، زمان، رات

کو ایک گلی میں سے گذر رہا تھا۔ وہ گلی کا موڑ مڑا تو وہاں کوئی آدمی گھات میں تھا۔ اُس نے زمان کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا۔ سارا چہرہ بُری طرح جل گیا۔ آنکھیں بالکل اندھی ہو گئیں۔ گردن، کندھے اور سینے کا بھی کچھ حصّہ جل گیا۔ زمان درد سے چیخنے چلّانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ وہ تیزاب پھینکنے والے کے پیچھے دوڑنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

پندرہ سولہ دنوں بعد اس واردات کی تفتیش سی۔ آئی۔ اے کے سپرد کر دی گئی اور یہ مجھے سونپی گئی۔ سی۔ آئی۔ اے میں فرشتے نہیں ہوتے تھے۔ پولیس کے اس شعبے کے اختیارات خاصے وسیع تھے۔ سی۔ آئی۔ اے کے طریقۂ تفتیش میں تشدّد اور ایذا رسانی (تھرڈ ڈگری) کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اسی لیے اسے دُرلی جتھہ کہا جاتا تھا۔ دُرلی موٹے چمڑے کی ایک چیز ہوتی تھی جس کی شکل بھانڈوں کے طمانچے سے ملتی جلتی تھی۔ دُرلی کو عموماً بھگو کر رکھتے تھے اور مشتبہ آدمی کو مُرغا بنا کر کمر کے نیچے کُولہوں کے درمیان مارتے تھے۔ اس کی ضرب پتھر جیسے ملزموں کی چیخیں نکال دیتی تھی۔ پنجاب میں مشہور تھا کہ سی۔ آئی۔ اے کا سارا کمال چمڑے کی دُرلی میں ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس شعبے کے لیے تعلیم یافتہ اور ذہین پولیس افسروں کو منتخب کیا جاتا تھا۔

میں واردات والے علاقے کے تھانے میں گیا۔ ایس۔ ایچ۔ او سب انسپکٹر کبیر ناتھ تھا۔ اس سے تمام تر معلومات لیں۔ کاغذوں پر جو کچھ آ چکا تھا، اس کا مطالعہ کیا۔ مشتبہ افراد کی فہرست دیکھی۔ ہر ایک کے متعلق پوچھا کہ اسے کیوں شاملِ تفتیش کیا گیا ہے۔ اور بھی بے شمار باتیں تھیں جو کبیر ناتھ سے معلوم

کیں۔ مجھے بتایا گیا کہ زمان کا خاندان پنجابی ہے لیکن کاروبار چونکہ دِلّی میں تھا اس لیے یہ لوگ دِلّی کے ہی ہو کے رہ گئے۔ اُن کے پانچ چھ گھرانے تھے۔ یہ لوگ تاجر بھی تھے اور زمیندار بھی۔ زمان ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ آرمی کنٹریکٹر اور سپلائر تھا۔ دِلّی اور گڑگاؤں کے درمیان کہیں اُس کی بہت سی زمین بھی تھی جو زیرِ کاشت تھی۔ زمان کی دو بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔

زمان کے متعلّق بتایا گیا کہ شہزادہ تھا۔ اُس کی شادی ہوئے چھ مہینے گذر چکے تھے۔ چال چلن اچھا نہیں تھا۔ چال چلن کے لحاظ سے تو سارا خاندان کچھ ایسا ویسا ہی تھا۔ دولت کی فراوانی نے اُن کے ہاں نہ اخلاق رہنے دیا تھا، نہ مذہب۔ فوج کی ٹھیکیداری اور رشوت لازم و ملزوم ہوتی ہیں۔ سپلائی سے تعلّق رکھنے والے فوجی افسروں کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔ اُن کی ہر فرمائش پوری کرنی ہوتی ہے۔ انہی افسروں سے دس کے سَو وصول کیے جاتے ہیں۔ لین دین کا یہ سلسلہ انگریزوں کے دَورِ حکومت میں بھی چلتا تھا، اب بھی چلتا ہے۔ انگریزوں کے دَور میں رُکا رُکا اور چوری چھپے چلتا تھا۔ پاکستان میں کُھلم کُھلا چلتا ہے اور اسے جائز سمجھا جاتا ہے۔

لین دین کے اس سلسلے میں زمان کے خاندان نے اپنے آپ کو "سوشل" بھی بنا رکھا تھا۔ جوان لڑکیاں بے پردہ گھومتی پھرتی تھیں۔ تعلیم نہایت معمولی اور اداکاری زیادہ تھی۔ اس خاندان کے تمام گھرانے انگریزوں کو ساری دنیا کا بادشاہ سمجھتے تھے اور اُن کی خوشنودی کے لیے ناجائز طریقے بھی فخر سے اختیار کرتے تھے۔ بعد میں جب تحریکِ پاکستان کی ابتدا ہوئی تو اس خاندان نے مسلمانوں

کا مذاق اُڑایا، جنگِ عظیم میں انگریزوں کے جنگی فنڈ میں بے دریغ چندہ دیا، مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں کا ساتھ دیا، اور اب میں اُن کے نام جو ظاہر نہیں کر رہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خاندان جیسے بے شمار مسلمان خاندانوں کی مخالفت کے باوجود پاکستان بن گیا تو زمان کے خاندان نے پاکستان کو جانے والوں پر قہقہے لگائے مگر ہندوؤں اور سکھوں نے انہیں بھی آنکھیں دکھائیں تو وہ بوریا بستر سمیٹ کر پاکستان آ گئے۔ اب وہ پاکستان کے معزز شہری اور سرکاری ٹھیکیدار ہیں۔ ملک کی سیاست میں ان کا عمل دخل ہے اور سرکاری تقریبوں کے مدعوئین میں یہ لوگ شامل ہوتے ہیں۔

یہ اس خاندان کے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا کہ یہ کیس سی۔ آئی۔ اے کے سپرد ہو گیا۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ زمان کے باپ نے انگریز فوجی افسروں سے کہا تھا کہ متعلقہ تھانیدار تفتیش میں کوتاہی کر رہا ہے۔ انگریز افسروں نے اُس کی خوشنودی کی خاطر کیس سی۔ آئی۔ اے کے سپرد کرا دیا تھا، ورنہ سب انسپکٹر ڈکبر ناتھ کوتاہی کا مرتکب نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کیس اتنا اہم بھی نہیں تھا کہ پولیس اور فوج کے انگریز افسر پریشان ہو جاتے اور اس کی تفتیش میں ذاتی دلچسپی لیتے۔ اس تھانے میں تو قتل کے کیس بھی زیرِ تفتیش تھے۔

خوبصورت اور آوارہ شہزادہ

یہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں۔ میں اس خاندان کی بڑی پرانی واردات

سُنا رہا ہوں۔ زمان کے مُنہ پر تیزاب پھینک کر گمنام ملزم بھاگ گیا۔ زمان کچھ دیر چیخ چلّا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ گلی کے اگلے موڑ سے ایک ریڑھی اِدھر کو مُڑ رہی تھی۔ اسے دو آدمی دھکیل رہے تھے۔ تیزاب پھینکنے والا اندھا دُھند دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ ریڑھی سے ٹکرایا اور گر پڑا۔ ریڑھی والوں نے کسی کی چیخ وپکار سُنی تھی۔ انہوں نے ریڑھی سے ٹکرانے والے کو اندھا دُھند بھاگتے دیکھا تھا۔ انہوں نے اُسے پکڑ لیا۔ وہ آدمی تنومند اور دراز قد تھا۔ ریڑھی والے محنت و مشقت کرنے والے خوانچہ فروش تھے۔ اس آدمی کو گرفت میں نہ رکھ سکے۔ وہ آدمی ان کی گرفت سے نکلا اور پھر گر پڑا۔ دونوں ریڑھی والوں نے اُسے پھر پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ گتھم گتھا ہوئے لیکن وہ آدمی ان دونوں کو گرا کر نکل گیا۔

اُس زمانے میں لوگ پولیس کی مدد کرتے تھے۔ اُس وقت کسی کو یہ خطرہ نہیں ہوتا تھا کہ کسی مجرم کو پولیس کی پُشت پناہی حاصل ہے، یا یہ کہ تھانوں اور عدالتوں کے چکّر کاٹنے پڑیں گے۔ پولیس مجرموں کی خبر دینے والوں اور گواہوں کا تحفظ کیا کرتی تھی۔ ان ریڑھی والوں نے بھی اپنا فرض ادا کیا تھا لیکن مجرم نکل گیا۔ پھر بھی اُن کی محنت ضائع نہ گئی۔ مجرم کی ایک جُوتی گلی میں رہ گئی جو تھانے میں پڑی تھی۔ یہ زری جُوتی کا ایک پاؤں تھا۔ ایسی تِلّے دار جُوتی پنجاب میں پہنی جاتی تھی۔ دھینگا مُشتی میں جوتی کا ایک پاؤں وہیں رہ گیا۔

ریڑھی والوں نے ایک اور نشانی یہ بتائی کہ مجرم کی دائیں ٹانگ سے اتنا خون نکل رہا تھا کہ اُس طرف سے شلوار لال ہو گئی تھی۔ ان کے خیال کے

مطابق زخم ران پر تھا اور یہ زخم ریڑھی کی ایک اُکھڑی ہوئی لوہے کی موٹی پتری سے آیا تھا۔ وہ ریڑھی سے اسی جگہ ٹکرایا اور گرا تھا۔ میں نے بعد میں ریڑھی دیکھی۔ اس کی اُکھڑی ہوئی پتری کا سرا بھی دیکھا۔ اسے ران پر ہی لگنا چاہیے تھا۔ ریڑھی والوں نے بتایا کہ اس آدمی نے سفید شلوار اور قمیض پہن رکھی تھی۔ سر اور منہ پگڑی یا چادر میں ڈھکا ہُوا تھا۔

زری جوتی، پگڑی اور شلوار قمیض سے یہ ثابت ہو گیا کہ مجرم مسلمان تھا۔ ہندوستان میں آج کل کی طرح ہندو مسلم کشیدگی اُس وقت بھی تھی۔ اکیلے دکیلے مسلمان پر ہندوؤں کے قاتلانہ حملے ہوتے رہتے تھے، لیکن یہ واردات فرقہ وارانہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ایک اس لیے کہ دِلّی میں اُن دنوں ہندو مسلم کشیدگی کی کوئی وجہ نہیں تھی اور دوسرے اِس لیے کہ وہ محلّہ مسلمانوں کا تھا۔ کسی کے منہ پر تیزاب پھینکنے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے پولیس انسپکٹر ہونا ضروری نہیں۔ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ایسی واردات کا باعث عداوت ہوتی ہے یا یہ واردات انتقامی طور پر کی جاتی ہے۔ یہ کارروائی رہزنی کی نیّت سے نہیں کی جاتی۔ لہٰذا مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ جس پر تیزاب پھینکا گیا، اُس کی دشمنی کس کے ساتھ تھی۔ دشمنی معلوم کرنے کے لیے متعلقہ فرد کے گھریلو اور ذاتی حالات، عادات اور چال چلن معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دشمنی کاروبار کے معاملے میں بھی ہو سکتی ہے اور جائیداد کے سلسلے میں بھی۔ رقابت بھی ایک عام وجہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ سب انسپکٹر کیسر ناتھ نے جو تفتیش کی تھی (اور جو اُسے کسی نتیجے پر نہیں پہنچا سکی تھی) اس کے مطابق زمان کا کوئی دشمن نہیں تھا۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ کیس اثر و رسوخ کے تحت سی۔ آئی۔ اے کو دیا گیا تھا۔ علاقے کے تھانیدار، کبیر ناتھ پر بلا جواز کوتاہی کا شک کیا گیا۔ وہ تفتیش کر رہا تھا تو زمان کا باپ اور چچے مامے اُسے پریشان کرتے رہتے تھے کہ وہ کچھ نہیں کر رہا۔ اس سے اُس کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ بہر حال میں نے اُس کے بالائی افسروں کے دلوں سے اُس کے خلاف شک نکال دیا تھا۔ کبیر ناتھ نے زمان (مغرور) کے متعلق مجھے بتایا کہ خوبصورت جوان ہے اور چال چلن کا بہت بُرا۔ اسے آوارہ شہزادہ کہہ لیں۔ دولت مند ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ بُری طرح بگڑا ہُوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس کی آوارگی کا باعث صرف لاڈ اور پیار نہیں، دولت بھی۔ مجھے تفتیش اپنے انداز میں شروع کرنی تھی۔

مستورات بھی شامل ہیں

میں جب وہاں گیا تو زمان کا باپ، چچا اور ماموں مجھے ملے۔ اُن کے ملنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مجھے اپنا ملازم سمجھ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے اس قسم کے حکم سُنانے شروع کر دیے کہ زیادہ سے زیادہ تین دن تک ملزم ہمارے سامنے آجائے۔ ہم زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔ پولیس کپتان سے کہہ کر ہم دو اور انسپکٹر بلا لیں گے۔

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ زمان کے باپ نے جب یہ کہا کہ آپ نے ملزم کو پکڑ لیا تو ہم آپ کو انعام دیں گے تو میری برداشت کی حد ختم ہو گئی۔

میں نے غصے کو دبا کر اور ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لا کر اور فدوی کمترین کا مرا مرا سا لہجہ اختیار کر کے کہا کہ میں حضور کا خادم ہوں۔ حضور صرف یہ خیال رکھیں کہ میں فرشتہ نہیں ہوں اور میں جن بھوت اور جادوگر بھی نہیں ہوں۔ گناہگار سا انسان ہوں۔ ملزم کو پکڑنے کی پوری کوشش کروں گا لیکن تین دنوں کا وعدہ نہیں کروں گا۔

"ہمارا مطلب یہ ہے کہ تفتیش میں سستی نہ ہو"۔ زمان کے باپ نے کہا ۔ "پولیس کپتان ہمارا یار بیلی ہے۔ ہم اشارہ کریں تو ۔ ۔ ۔ ۔"

"جناب عالی!" میں نے اُسے "تو" سے آگے بولنے نہ دیا اور کہا ۔ "میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ پولیس کپتان انگریز ہے اور انگریز کسی ہندوستانی کنٹریکٹر کے یار بیلی نہیں ہوتے۔ میں آپ کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میری بات غور سے سُن لیں۔ تفتیش کے دوران مجھے آپ کے گھر کے افراد سے بھی کچھ پوچھنا پڑے گا۔ ان افراد میں مستورات بھی شامل ہیں۔ اگر آپ نے تعاون نہ کیا تو میں پولیس کپتان کو اطلاع دے کر تفتیش ادھوری چھوڑ جاؤں گا۔ مجھے جس وقت ضرورت محسوس ہوگی آپ کے گھر جا پہنچوں گا۔ آپ کے کسی بھی فرد کو تھانے بلاؤں گا۔"

"لیکن یہ خیال رکھنا کہ ہم عزت دار لوگ ہیں"۔ زمان کے ماموں نے کہا ۔ "ہمارے گھروں میں تھانیداروں کی طرح نہ آنا۔"

"میری نظر میں آپ سب مشتبہ ہیں"۔ میں نے لہجے کی نرمی ختم کر کے تھانیداروں کے رعب سے کہا ۔ "آپ لوگ تشریف لے جائیں اور مجھے اپنا

کام کرنے دیں۔"

وہ مجھے گھورتے ہوئے چلے گئے۔ کبیر ناتھ نے مجھے بتایا کہ اُسے بھی وہ پولیس کپتان کا رعب دیتے رہتے تھے۔

میں نے ریڑھی والوں کو بلوایا اور جائے واردات پر چلا گیا۔ یہ قدیم دِلّی کی قدرے کشادہ گلی تھی۔ ایک وہ موڑ تھا جو زمان مُڑا تو اُس پر تیزاب پھینکا گیا اور چھ سات گھر آگے وہ موڑ تھا جہاں تیزاب پھینکنے والا ریڑھی سے ٹکرایا تھا۔ اس گلی میں متوسط اور اس سے نیچے طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ میں نے کبیر ناتھ سے پوچھا کہ زمان کا گھر کہاں ہے۔ اُس نے بتایا کہ یہاں سے دو اڑھائی میل دُور ہے اور وہ علاقہ امیروں کبیروں کی حویلیوں کا علاقہ ہے۔ اُس زمانے میں کوٹھیوں کا اتنا رواج نہیں تھا جتنا آج ہے۔ وہ محلات جیسی حویلیوں اور چوباروں کا زمانہ تھا۔

میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ زمان جیسا شہزادہ رات ساڑھے دس بجے ان گلیوں سے کیوں گذر رہا تھا۔ میں دِلّی سے اچھی طرح واقف تھا۔ اگر زمان نے اپنے گھر کو جاتے ان گلیوں کا راستہ چھوٹا سمجھا تھا تو یہ میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ یہ اُس کا راستہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اُسے پیدل جانے کی کیا سُوجھی تھی؟ وہ تانگے پر کیوں نہ گیا؟ اگر وہ واقعی دولت و مال والے کا بیٹا تھا تو ان گلیوں میں اُس کا کوئی دوست نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ غریبوں کا محلّہ تھا۔ بہرحال اس سوال کا جواب مجھے زمان سے لینا تھا۔

ہندو لڑکی کی دوستی

میں جب ایک سب انسپکٹر اور دو تین کانسٹیبلوں کے ساتھ گلی کا جائزہ لے رہا تھا تو گلی میں رہنے والے اکٹھے ہو گئے۔ میں نے اِن میں سے چند ایک سے پوچھا کہ جس آدمی کے مُنہ پر تیزاب پھینکا گیا تھا اُسے وہ جانتے تھے؟ یا اُسے کسی نے پہلے کبھی اس گلی سے گذرتے دیکھا تھا؟ ــــ اِن میں سے کوئی بھی زمان کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے انہیں زمان کا اتا پتہ بتایا تو بھی وہ اُسے نہ پہچان سکے۔ میرے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ زمان جیسے آوارہ امیرزادے لوگوں کی بہو بیٹیوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے زمان کی نظر کسی لڑکی پر ہو اور وہ اُس کے پیچھے اس گلی میں آتا ہو۔

جو لوگ تماشہ دیکھنے جمع ہو گئے تھے، ان میں سے پانچ چھ نے بتایا کہ واردات کی رات انہوں نے کسی کی چیخ و پکار سُنی تو وہ باہر نکل آئے۔ گلی میں روشنی بہت مدھم تھی۔ صرف ایک بلب جل رہا تھا جو اگلے موڑ پر تھا۔ یہ وہ موڑ تھا جہاں ریڑھی آ رہی تھی۔ محلے والوں نے دیکھا کہ ریڑھی کے قریب تین آدمی گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ محلّے والے اُدھر کو دوڑے مگر لڑائی ختم ہو گئی اور ایک آدمی بھاگ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی دوسرے موڑ پر پڑا ہے۔ ایک دو لالٹینیں اور ایک دو ٹارچیں آ گئیں۔ اس بے ہوش آدمی کا چہرہ بگڑ رہا تھا۔ کھال رنگ بدل رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ اس کے مُنہ پر تیزاب پھینکا گیا

ہے۔کوئی بھی اسے نہ پہچان سکا۔

کسی نے کہا پولیس کو اطلاع دو۔کسی نے کہا ہسپتال لے چلو اور کسی نے کہا پولیس کو یہیں بلاؤ۔آخر یہ فیصلہ ہُوا کہ اسے ریڑھی پر ڈالو اور تھانے لے چلو۔ چنانچہ زمان کو ریڑھی پر ڈالا گیا۔ ریڑھی والوں نے بخوشی کہا کہ وہ اسے تھانے لے جائیں گے۔محلّے کا ایک پڑھا لکھا آدمی ان کے ساتھ ہو گیا۔سب انسپکٹر کبیر ناتھ نے اپنی کاغذی کارروائی کی اور زمان کو ہسپتال بھیج دیا۔اُس نے ریڑھی والے دونوں آدمیوں کو اور ان کے ساتھ جانے والے کو گواہ کے طور پر شاملِ تفتیش کر لیا۔ڈاکٹر نے رپورٹ لکھی کہ بڑا تیز تیزاب پھینکا گیا ہے جس سے آنکھیں ختم ہو چکی ہیں۔زمان پندرہ دنوں سے ہسپتال میں پڑا تھا۔مجھے بتایا گیا کہ وہ دوسرے دن ہوش میں آ گیا تھا۔کبیر ناتھ نے اُس سے پوچھا تھا کہ اُسے کس پر شک ہے۔ اُس نے کسی پر بھی شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میں ہسپتال زمان کے پاس چلا گیا۔اُسے دیکھ کر بہت افسوس ہُوا۔اُس کا سر اور چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہُوا تھا۔آنکھیں بھی پٹیوں میں چھُپی ہوئی تھیں۔سانس لینے کے لیے ناک ذرا سی ننگی اور کھانے پینے کے لیے ہونٹ پٹیوں سے باہر تھے۔ہونٹ بھی جلے ہوئے تھے۔ان کا گوشت کھچا ہُوا اور بگڑا ہُوا تھا۔ایک کان پٹیوں میں تھا۔دوسرا ننگا تھا۔مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ بڑا خوبصورت جوان تھا۔اس کے ہاتھوں اور بازوؤں کے رنگ سے پتہ چلتا تھا کہ خوبصورت تھا مگر اب میں تصور میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا چہرہ کس قدر بھیانک ہو گیا ہو گا۔میں نے اپنے آپ سے کہا کہ خدا نے اسے جلنے کون سے گناہ کی سزا دی ہے۔

اُس کے پاس جو تیماردار بیٹھے تھے، انہیں میں نے باہر نکال دیا۔ کبیر ناتھ نے اُسے بتایا کہ میں کون ہوں۔ وہ دھیمی آواز میں بول سکتا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا اور اس کا اتنا خوبصورت چہرہ بگاڑ دینے والے کو بُرا بھلا کہا اور یہ بھی کہا کہ اُس شخص کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر کے دم لوں گا۔ میری ہمدردی کا یہ اثر ہُوا کہ وہ ہچکیاں لینے لگا۔ وہ کچھ دیر روتا رہا۔ اُس کے دل پر پوری طرح قبضہ کر کے میں نے دوستانہ لہجے میں پُوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ کسی پر بھی شک کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ کسی پر اُسے ذرا سا بھی شک ہے تو اُس کا نام بتا دے، مگر اُس نے کسی کا بھی نام نہ لیا۔

"دیکھو زمان!" — میں نے کہا — "مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ، ورنہ میں مجرم کو نہیں پکڑ سکوں گا۔ تم مجھے جو کچھ بتاؤ گے وہ کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ مجھے بتاؤ کہ شادی سے پہلے یا اب بھی تمہاری کسی لڑکی کے ساتھ محبت ہوگی اور تمہارا کوئی رقیب ہوگا۔"

اُس نے انکار میں سر ہلایا۔

"تم اتنے خوبصورت جوان ہو" — میں نے اُسے ہوا دینے کے لیے کہا — "تم پر لڑکیاں مرتی ہوں گی۔"

اُس نے پھر انکار میں ہی سر ہلا دیا۔

"تم اُس گلی میں کیا کرنے گئے تھے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو اُس نے کہا — "ایک دوست کے گھر گیا تھا۔"

"اُس کا نام ؟" — میں نے پوچھا "کہاں رہتا ہے؟"

"وہ بڑا اچھا دوست ہے" — اُس نے کہا — "اُس سے کچھ پُوچھنے کی ضرورت نہیں"۔

"میں اُس سے بہت کچھ پوچھنے کی بڑی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں"۔

اُس نے اس دوست کا نام نہ ہی بتایا۔ میں نے بہت جھک جھک کی مگر وہ ٹالتا رہا۔ سب انسپکٹر کبیر ناتھ نے مجھے اشارہ کیا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ کسی دوست کے ہاں نہیں گیا تھا۔

"اُس گلی میں سے پہلے بھی کبھی گزرے ہو؟"

"پہلی بار گزرا تھا" — اُس نے جواب دیا۔

"اس سے پہلے تم جہاں کہیں بھی گئے تھے، وہاں کسی سے لڑائی جھگڑا ہُوا تھا؟"

"نہیں"۔

"زمان! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو" — میں نے کہا — "مجھے تمہارے ذاتی حالات کے ساتھ کوئی ذاتی دلچسپی نہیں۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ کسی نہ کسی کے دل میں تمہاری دشمنی ہے۔ تم نے کسی کو کسی وجہ سے پریشان کیا ہوگا، کسی کا دل توڑا ہوگا، کسی کی بہو بیٹی پر دست درازی کی ہوگی۔ اُس نے تم سے انتقام لیا ہے۔ تم ذرا سا اشارہ دے دو۔ اُس آدمی کو پکڑنا میرا کام ہے"۔

اُس نے جواب دینے سے ہی انکار کر دیا۔ میں نے اپنے انداز سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ جس طرح جواب دے رہا تھا اس سے مجھے شک ہو رہا تھا کہ

صحیح جواب دینے سے بچ رہا ہے۔ ایک بار اُس نے یہ بھی کہا کہ اُسے جواب دیتے تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ لیٹ جائے اور آرام آرام سے بولے۔ میں اُس کے پیچھے پڑا رہا۔

"تمہارے دوستوں یا دشمنوں میں زری جُوتی کون پہنتا ہے؟"

"ہمارے خاندان کے پانچ چھ آدمی زری جُوتی پہنتے ہیں"۔ اُس نے جواب دیا۔

مشکل یہ تھی کہ وہ جُوتی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے جُوتی کا حلیہ بیان کیا تو اُس نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا کہ جوتی کے ایک پاؤں سے وہ کسی آدمی کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اُس پر تیزاب پھینکنے والے نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اُس نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا کہ اس سے بھی وہ کسی کا نام نہیں لے سکتا۔

وہ اوٹ پٹانگ اور ٹال مٹول کے انداز سے جواب دے رہا تھا۔ میں جھنجھلا اٹھا۔ میں نے کہا۔ "زمان! مجھے تمہارے ساتھ دلی ہمدردی ہے لیکن میں تمہیں صاف بتاتا ہوں کہ تم شریف آدمی نہیں ہو۔ تمہارے چال چلن کے متعلق مجھے پوری رپورٹ مل چکی ہے۔ تم مرو یا جیو، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے اور میں فرض ادا کر کے رہوں گا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھ سے جو کچھ چھپا رہے ہو، وہ میں جانتا ہوں۔ میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں"۔ میں نے ہوا میں تیر چلایا۔ "اس محلے میں تمہاری آشنائی جس عورت کے ساتھ ہے اُس کے کسی بھائی یا باپ نے یا اُس کے کسی اور چاہنے والے

نے تم پر تیزاب پھینکا ہے۔"
اُس کے مُنہ سے نکل گیا ــ "ہندوؤں میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی۔"
"تو اُس رات تم اُسی سے ملنے گئے ہو گے۔"
"نہیں" ــ اُس نے کہا ــ "اُس رات میں کہیں اور سے آ رہا تھا۔"
بات اُس کے مُنہ سے نکل گئی تھی۔ اُسے اُس نے نگلنے کی کوشش نہ کی۔ میری حوصلہ افزائی سے اُس نے بتا دیا کہ واردات والی گلی سے تھوڑی ہی دُور ایک ہندو لڑکی کے ساتھ اُس کی دوستی ہے۔ یہ لڑکی شادی کے پانچویں مہینے بیوہ ہو گئی تھی۔ اُس کی عمر ابھی بیس سال بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے ہاں بیوہ کو دوسری شادی کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس غیر انسانی ظلم سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی ایک مثال یہ تھی۔ زمان اُسے اُس کے گھر کے قریب ایک غیر آباد مکان میں جو کسی حد تک کھنڈر بن چکا تھا، ملا کرتا تھا۔
"اس لڑکی کی دوستی کسی اور کے ساتھ بھی ہو گی" ــ میں نے کہا۔
"نہیں۔"
"میں مان نہیں سکتا" ــ میں نے کہا ــ "اور میں سمجھ نہیں سکتا کہ تم چُھپا کیوں رہے ہو۔"
"پھر مجھے معلوم نہیں۔"
"کیا اپنی شادی کے بعد بھی تم نے اس لڑکی سے دوستی جاری رکھی؟"
"ہاں جی۔"
یہاں سے مجھے یہ خیال آیا کہ اس ہندو لڑکی کی دوستی کسی اور کے ساتھ

بھی ہو گی یا کوئی اور اس لڑکی کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوگا اور اُس نے زمان کو رکاوٹ سمجھا ہوگا مگر زمان کہہ رہا تھا کہ اُسے معلوم نہیں۔ یہ اب مجھے معلوم کرنا تھا۔ میں نے زمان سے کہا کہ میں اُس کے پاس پھر آؤں گا اور وہ مجھے وہ باتیں بھی بتا دے جو وہ مجھ سے چھپا رہا ہے۔

بداخلاقی کی پستیوں کے کیڑے مکوڑے

میں جب زمان کے باپ سے ملنے اُس کے گھر گیا تو زمان کا چچا اور ماموں بھی آ گئے۔ حویلی محل جیسی تھی۔ میں نے پہلے ان تینوں کے ساتھ بات کی اور انہیں بتایا کہ یہ واردات انتقامی ہے۔ زمان نے کسی کو پریشان کیا ہوگا یا کسی کی بہو بیٹی سے دست درازی کی ہوگی یا آپ میں سے کسی نے کسی کے ساتھ کوئی ناقابلِ برداشت زیادتی کی ہوگی۔ کسی کی بے عزتی کی ہوگی۔

تینوں بیک وقت بول پڑے ”نہ جی نہ“ — پھر زمان کے ماموں نے تقریر شروع کر دی جس میں اُس نے مجھے یہ بتایا کہ وہ بہت شریف لوگ ہیں، بڑے سخی ہیں۔ وقتاً فوقتاً غریبوں کو اکٹھا کر کے انہیں کھانا کھلاتے ہیں اسی لیے انگریز افسر اس خاندان کی عزت کرتے ہیں۔

”زمان کا چال چلن کیسا ہے؟“

”وہ تو بھولا بادشاہ ہے جی!“ — اُس کے باپ نے جواب دیا — ”ہمیں پتہ چل جائے کہ اُس پر تیزاب کس نے پھینکا ہے تو آپ بھی دیکھ لینا، اُس کی

لاش نہیں ملے گی۔"

"لیکن جس طرح آپ باتیں کر رہے ہیں اس طرح تو کبھی بھی پتہ نہیں چلے گا کہ وہ کون ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ یہ کسی دشمن کا حملہ تھا۔ یہ تو مجھے آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ آپ لوگوں کا یا زمان کا دشمن کون ہے۔ دشمنی کاروباری بھی ہو سکتی ہے۔ جائیداد کے تنازعے پر بھی ہو سکتی ہے۔"

وہ تینوں میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے تھے۔ میں نے زمان کے چچا اور ماموں کو وہاں سے اُٹھا دیا۔ میں زمان کے باپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

"جب تک آپ میرے ساتھ تعاون نہیں کریں گے میں کچھ نہیں کر سکوں گا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اب آپ میرے ساتھ اکیلے ہیں۔ مجھے در پردہ بتا دیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا.... میں آپ کو یقین سے بتاتا ہوں کہ آپ کے بیٹے کا چال چلن بہت بُرا ہے۔ مجھے یہ بتائیں کہ اس سلسلے میں اس کی دشمنی کس کے ساتھ تھی۔"

اُس نے پھر بھی زمان کی تعریفیں کیں۔ میں ان لوگوں کے دشمنوں کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ زمان کی شادی کو صرف چھ مہینے گذرے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس رشتے کے سلسلے میں عداوت پیدا ہو گئی ہو۔ میں نے زمان کے باپ سے پوچھا کہ زمان کی بیوی کے ایک دو اور امیدوار بھی ہوں گے۔ مجھے بتائیں کہ یہ رشتہ کس طرح طے ہوا تھا۔

"جس طرح رشتے طے ہوتے ہیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "میرے

بیٹے کو تو دس لڑکیوں کے رشتے مل رہے تھے۔"

اُس نے مجھے پریشان کر دیا۔ مجھے اپنے آپ پر ہمیشہ قابو رہتا تھا لیکن اس شخص نے میرا غصّہ میرے قابو سے نکال دیا۔ میں نے غصّے سے کانپتی ہوئی اور دھیمی سی آواز میں کہا — "دولت اور ٹھیکیداری اور انگریزوں کی چاپلوسی مل کر بھی تم لوگوں کے گناہوں کو لوگوں کی نظروں سے نہیں چھپا سکتیں۔ تم تصوّر میں اپنے آپ کو اتنا اُونچا لے گئے ہو کہ تمہیں خدا بھی یاد نہیں رہا۔ تم بداخلاقی کی پستیوں میں رینگنے والے کیڑے مکوڑے ہو۔ میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ تمہارے خاندان کے متعلق بہت کچھ معلوم کر کے یہاں آیا ہوں۔ تمہارے کہنے سے میں تمہیں اور تمہارے بیٹے کو شریف اور پارسا نہیں کہہ سکتا۔"

"ایک تو ہمارے لڑکے کی زندگی تباہ ہو گئی ہے دوسرے آپ ہماری بے عزّتی کر رہے ہیں" — اُس نے غصیلی آواز میں کہا — "آپ تفتیش کریں۔ ہمیں ملزم نہ سمجھیں۔"

"مجھے آپ کے لڑکے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں" — میں نے کہا — "میں اُس قانون کا محافظ ہوں جو اس ملک میں چل رہا ہے۔ اس قانون پر زد پڑی ہے۔ مجھے اُس مجرم کو پکڑنا ہے جس نے اس قانون کی توہین کی ہے اور اُسے زیادہ سے زیادہ سزا دلانی ہے تاکہ کل کوئی اور آدمی کسی اور آدمی کے مُنہ پر تیزاب پھینکنے کی جرأت نہ کرے، مگر آپ میری کوئی مدد نہیں کر رہے۔ ذرا چبوترے سے اُتریں اور میرے ساتھ کھُل کر بات کریں۔ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ میں آپ کو ملزم نہیں مشتبہ سمجھ رہا ہوں۔ آپ کی یا آپ کے بیٹے کی کسی ناقابلِ برداشت حرکت کی وجہ سے

یہ جرم سرزد ہُوا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ مجھے یہ بتا دیں کہ آپ کے یا آپ کے بیٹے کے ہاتھوں ستایا ہُوا وہ کون تھا جس نے اس ظالمانہ طریقے سے انتقام لیا ہے۔"

اُس کی جھاگ تو بیٹھ گئی لیکن معاملہ جلی ہُوئی رسّی کا تھا جل کر بھی بَل نہ گیا۔ اُس نے یہاں تک تسلیم کر لیا کہ زمان کی عادتیں اچھی نہیں تھیں۔ ہو سکتا ہے اُس نے باہر کوئی حرکت کی ہو۔ اس سے زیادہ مجھے اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہُوا۔

قرض کے بدلے بیٹی دے دی

میں یہ دیکھ چکا تھا کہ یہ اوچھے لوگ ہیں اور دولت نے ان کے ذہنوں کو زنگ لگا رکھا ہے۔ اتنی زیادہ باتوں سے اور پوچھ گچھ سے میں یقین کی حد تک محسوس کرنے لگا تھا کہ جو کچھ ہے ان پانچ چھ گھروں میں ہے۔ میں نے دماغ پر زور دیا تو میں نے زمان کی بیوی سے پوچھ گچھ کی ضرورت محسوس کی۔ بہت سوچا اور یہ فیصلہ کیا کہ زمان کے سُسر سے بات کی جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ لڑکی اور لڑکے کے سسرال میں عموماً چپقلش ہوتی ہے اور اکثر رشتے پیار اور محبّت کے زیرِ اثر نہیں لیے دیئے جاتے۔ ان کے پیچھے خاندانی سیاست ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی کو چھیڑ دو تو وہ ایک دوسرے کو ننگا کر دیتے ہیں۔ انہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر بھی بھید لیے جا سکتے ہیں۔ میرے دماغ پر اس واقعہ کا یہ پہلو بھی سوار تھا کہ زمان کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا اس لیے اُس کی

بیوی اس سے نالاں ہو گی اور سسر بھی شاید ناراض ہو۔

میں زمان کے سسر کے ہاں چلا گیا۔ اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ اُس نے بھی اپنا سر ذرا اُونچا رکھنے کی کوشش کی لیکن اُس کی پریشانی صاف ظاہر تھی۔ اُس کی باتوں میں جھجک تھی۔ وہ زمان کے باپ سے مختلف تھا۔ میں نے اُس کی اِس کیفیت سے فائدہ اٹھایا اور اس کے مطابق باتیں کر کے اُس کے دماغ پر قبضہ کر لیا۔ اُس سے پوچھا کہ اُسے کسی پر شک ہے؟ — وہ جھجک گیا۔

"آپ کھُل کر بات کریں" — میں نے کہا — "میں جانتا ہوں کہ زمان اچھے چلن کا آدمی نہیں۔ اُس سے کسی نے انتقام لیا ہے۔ مجھے افسوس اس بات پر آرہا ہے کہ یہ چوٹ آپ کی بیٹی پر پڑی ہے۔"

"میری بیٹی پہلے ہی سُکھی نہیں تھی" — یہ زخم خوردہ باپ تھا، پھٹ پڑا۔ میں نے ہمدردی سے اُس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ اُس نے کہا — "میں تو یہاں رشتہ دے ہی نہیں رہا تھا مگر دینا پڑا۔"

"کیا مجبوری تھی؟"

"میں مقروض تھا" — اُس نے کہا اور اُس کے آنسو نکل آئے۔

اُس کے سینے میں غبار بھرا ہوا تھا جسے وہ نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے غبار نکالنے میں اُس کی مدد کی۔ اپنی اُستادی چلائی اور وہ کھُل کر بولنے لگا۔ بات تو اُس نے بڑی لمبی سنائی تھی لیکن میں مختصر کر کے سُناتا ہوں۔ لڑکی (زمان کی بیوی) کے والدین اس کا رشتہ ایک اور گھر میں دینا چاہتے تھے۔ لڑکے والے کہتے تھے کہ شادی جلدی ہونی چاہیے لیکن لڑکی والے مقروض تھے۔ وہ ایک سال کی مہلت

مانگ رہے تھے۔ اس لڑکے کے بعد ایک اور لڑکا تھا۔ اس کے والدین بھی جلدی شادی کی کہہ رہے تھے۔

تیسرا امیدوار زمان تھا۔ اُس کے سُسر نے مجھے صاف الفاظ میں بتایا کہ اُس کی بیٹی زمان کو پسند نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ ان تمام گھرانوں کے مردوں میں زمان سب سے زیادہ خوب رُو بلکہ خوبصورت تھا اور زمان کا گھرانہ سب سے زیادہ مالدار تھا۔ لڑکی نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ اُسے زمان اچھا نہیں لگتا۔ لڑکی کے باپ نے مجھے بتایا کہ زمان میں اوچھاپن ہے۔ دوسری خرابی یہ کہ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں باپ نے اُسے شہزادہ بنا رکھا تھا۔ لڑکی کی ناپسندیدگی کی ایک اور وجہ یہ معلوم ہوئی کہ زمان نے اس لڑکی پر کبھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ لڑکی خود سر اور سرکش تھی۔ خوبصورت بھی تھی اور مقروض ہونے کے باوجود اپنے آپ کو امیر ماں باپ کی بیٹی سمجھتی تھی۔ یہ لوگ کاروبار کے سلسلے میں مقروض ہوئے تھے۔ ان کا رہن سہن امیرانہ تھا۔ لڑکی نے زمان کو دھتکار دیا تھا۔

اب لڑکی کے رشتے کی بات چلی تو زمان کے کہنے پر اُس کے باپ نے لڑکی کے باپ سے بات کی۔ لڑکی کے باپ نے صاف انکار کر دیا۔ زمان کے والدین کو پتہ چل گیا کہ لڑکی والے مقروض ہونے کی وجہ سے شادی جلدی نہیں کر سکتے اس لیے دونوں لڑکوں والوں نے رشتہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ اِدھر زمان ضد کر رہا تھا کہ وہ اسی لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا۔ اس کے باپ نے لڑکی کے باپ کو یہ پیش کش کی کہ وہ اُس کا سارا قرض ادا کر دے گا اور واپس صرف آدھا لے گا اور وہ بھی بڑی آسان قسطوں میں۔ لڑکی کا باپ منڈی میں شرمسار

ہو رہا تھا اور مقابلے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی لڑکی کا رشتہ ٹھکرا دیا گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے زمان کے باپ کی پیش کش قبول کر لی اور اُس سے قرض سے زیادہ رقم لے لی اور اپنی بیٹی کو روتا ڈولی میں بٹھا دیا۔

لڑکی سرکش اور خود سر تھی

زمان کو یہ لڑکی پسند تھی لیکن اس پسند میں محبت والی کوئی بات نہیں تھی۔ زمان اُسے صرف خوبصورت لڑکی سمجھتا تھا۔ لڑکی کے باپ نے بتایا کہ لڑکی جب پہلی ہی بار اپنے گھر آئی تو باپ کو یہ تلخ احساس پیدا ہو گیا کہ اُس نے لالچ میں آ کر اپنی بیٹی بڑے ہی غلط گھر میں ایک غلط آدمی کو دے دی ہے۔ زمان نے پہلی ہی ملاقات میں لڑکی سے کہا کہ میں نے تمہیں خریدا ہے۔ مختصر یہ کہ زمان نے اوچھے پن کے مظاہرے شروع کر دیے۔ اس کے بعد جو چھ مہینے گذرے وہ اس لڑکی کے لیے بڑا ہی تکلیف دہ عرصہ تھا۔ اُس کے باپ نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ اُس کی بیٹی اُس لڑکے کو چاہتی تھی جس کے ساتھ اُس کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ زمان کو تو وہ پسند کرتی ہی نہیں تھی۔

لڑکی سرکش اور خود سر تھی۔ اُس نے زمان سے دبکنے کی بجائے اُسے ترکی بہ ترکی جواب دینے شروع کر دیے۔ وہ اپنی ماں کو بتاتی رہتی تھی کہ زمان کے ساتھ اُس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے اور اُس کے ساتھ کیا باتیں ہوتی ہیں۔ زمان اُسے کہتا تھا کہ وہ برادری میں سب سے زیادہ خوبصورت نوجوان ہے

اور بے شمار لڑکیاں اُس پر مرتی ہیں اور اُس کی محبت کا دم بھرتی ہیں۔ وہ ایک ہندو لڑکی کا نام بار بار لیتا اور کہتا تھا کہ اُس کے مقابلے میں وہ (اُس کی بیوی) کچھ بھی نہیں۔

زمان کی بیوی نے تنگ آکر اُسے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اُسے بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ فیصلہ اُس کے باپ کا تھا کہ اُسے زمان کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ زمان نے ہنس کر کہا "تمہاری پسند اور ناپسند کی کسے پروا ہے۔ میں نے تمہیں خریدا ہے۔ نقد ادا کیا ہے۔ تم میری بیوی نہیں لونڈی ہو۔ زرخرید غلام ہو۔ میں تمہیں قیدی بنا کر رکھوں گا۔"

دونوں کے درمیان نفرت بڑھ گئی۔ زمان اپنی خوبصورتی اور دولت کا ذکر تکبّر کے لہجے میں کرتا تھا۔ اُس نے اپنی بیوی کو قیدی بنا لیا اور میاں بیوی کے تعلّقات توڑ دیئے۔ بیوی کو وہ اُس کے ماں باپ کے ہاں جانے سے نہیں روکتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کے سلوک سے بیوی پریشان ہو جائے گی اور سَر اُس کے قدموں میں رکھ دے گی لیکن بیوی کو جیسے اُس کی پرواہ ہی نہیں تھی۔ زمان کی کوشش یہ تھی کہ بیوی اُس کے آگے بولے اور وہ اُسے دق کرتا رہے۔

ایک روز اُس نے اپنی بیوی پر خوبصورتی کا رعب گانٹھنا شروع کر دیا۔ بیوی نے اُسے آخر کہہ ہی دیا "میں نے اپنی ماں کو بتا دیا تھا کہ مجھے زمان بالکل پسند نہیں اور اگر اُس کے ساتھ میری شادی ہو گئی تو بھی میں اُسے دل سے اپنا خاوند تسلیم نہیں کروں گی۔"

"تمہیں جو یار پسند ہے اُس کا نام لے کر دیکھو"۔ زمان نے کہا۔ "اُسے

ایسے طریقے سے قتل کروں گا کہ نہ لاش ملے گی نہ قاتل کا سُراغ... میں نے تمہیں کب پسند کیا تھا۔ تمہیں خوبصورت کون کہتا ہے۔ خوبصورت میں ہوں اور خوبصورت وہ ہندو لڑکی ہے جسے میں اشارہ کروں، تو وہ اپنے خون سے میرے پاؤں دھو ڈالے۔"

میں نے لڑکی کے باپ سے پوچھا کہ اُن کے درمیان یہ باتیں کب ہوئی تھیں۔ اُس نے بتایا کہ تیزاب پھینکنے والی واردات سے کوئی ایک مہینہ پہلے۔ لڑکی نے اپنے باپ کو بتایا تو باپ نے زمان کے ساتھ بات کی۔ زمان نے اُس کی بھی بے عزتی کر دی۔ باپ نے اپنی بیٹی کو بتایا تو بیٹی نے اُسے کہا کہ وہ آئندہ زمان کے ساتھ کوئی بات نہ کرے۔

"اس سے ایک مہینہ بعد خدا نے زمان کو یہ سزا دی"۔ لڑکی کے باپ نے کہا۔ "اگر وہ مر جاتا تو مجھے خوشی ہوتی۔ اُس کا صرف چہرہ بگڑا ہے۔ میری بیٹی پہلے ہی اس سے نفرت کرتی تھی۔"

کھانے میں زہر دے سکتی تھی

یہ چار دیواری کی دُنیا کی کہانی تھی۔ یہ میاں بیوی کی چپقلش تھی۔ میاں اوچھا تھا اور بیوی اُس سے نفرت کرتی تھی۔ مجھے زمان کے سُسر سے یہ ساری داستان سُننی پڑی کیونکہ میں نے خود اُسے بولنے پر اُکسایا تھا۔ اب میں سوچنے لگا کہ اتنی طویل داستان سے (جو میں نے اختصار سے سُنائی ہے) مجھے کچھ حاصل ہو سکتا ہے؟ میں تو یہ معلوم کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ زمان

کا ایسا دشمن کون تھا جس نے اُس پر ایسا بھیانک وار کیا۔ اس کہانی میں جو زمان کے سُسر نے سُنائی، صرف زمان کی بیوی تھی جس کے دل میں زمان نے دشمنی اور نفرت کا بیج بویا تھا۔ میں اس سوال پر غور کرنے لگا کہ بیوی زمان پر ایسا وار کر سکتی ہے؟ ایک ہی صورت ہے کہ اُس نے کسی کرائے کے آدمی سے یہ کام کرایا ہے۔ لڑکی کے متعلق بتایا گیا تھا کہ سرکش اور خودسر ہے۔

نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ لڑکی ایسا کام نہیں کرا سکتی۔ اگر کراتی تو زمان کو قتل کرا دیتی۔ اُسے کھانے میں زہر بھی دے سکتی تھی۔ تاہم میں نے اس لڑکی سے بھی ملنا ضروری سمجھا لیکن فوراً نہیں۔ میری توجہ اُس ہندو نوجوان بیوہ پر مرکوز ہوگئی جسے زمان نے دوست بنا رکھا تھا۔ وہاں مجھے رقابت کا شک تھا۔

میں نے شام کے بعد اس ہندو لڑکی کو تھانے بُلایا۔ مجھے اُس کا نام یاد نہیں رہا۔ اسے شیلا کہہ لیں۔ اُس کا بھائی اور باپ بھی ساتھ آگئے اور ان کے ساتھ محلے کے دو معزز ہندو بھی تھے جنہوں نے مجھ سے پُوچھا کہ لڑکی کو کیوں بلایا گیا ہے۔ میں نے اُنہیں صاف بتا دیا کہ کیوں بلایا ہے۔ انہیں یہ تسلی بھی دی کہ لڑکی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی اور اس کی عزت کا پُورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اس کے ثبوت میں میں نے انہیں بتایا کہ لڑکی اور اُس کے والدین کی عزت کا خیال نہ ہوتا تو میں اسے دن کے وقت بُلاتا۔

لڑکی کو میں کمرے میں لے گیا۔ اُس کے بھائی، باپ اور دوسرے دو ہندوؤں کو برآمدے میں کرسیوں پر بٹھا دیا۔ لڑکی کی گھبراہٹ قدرتی تھی۔ وہ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی نوجوانی کا خیال آیا تو مجھے اس پر ترس آگیا۔ جی میں آئی کہ باہر بیٹھے

ہُوئے ہندوؤں سے لکھوں کہ ظالمو! مذہب کی آڑ میں تم اپنی معصوم بچیوں پر کیا ظلم کر رہے ہو، لیکن میرا فرض کچھ اور تھا۔ کسی کے مذہب کے ساتھ میرا کوئی تعلّق نہیں تھا۔

میں نے شیلا کی گھبراہٹ دُور کرنے کی کوشش کی اور اُسے بتایا کہ اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ ہر بات بتا دے اور کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے اُسے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ جو کچھ بتائے گی وہ میرے سینے میں راز رہے گا۔ اس کمرے سے باہر کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا اور اگر اُس نے میرے ساتھ ہیرا پھیری کی کوشش کی تو اُس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو پولیس والے کیا کرتے ہیں۔

وہ ڈر گئی اور اُس نے سر جُھکا لیا۔ میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کہ وہ اسی عمر میں بیوہ ہوگئی ہے۔ پھر میں نے باتوں میں اُسے ایسا تاثر دیا کہ وہ جس راستے پر چل نکلی ہے اس میں وہ حق بجانب ہے۔ اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ مجھے اپنا ہمدرد اور غم خوار سمجھ رہی ہو۔

پنڈت، پرارتھنا اور پیار

"ذرا اس پر غور کرو کہ میں نے تمہیں کیوں بُلایا ہے" — میں نے کہا۔ "مجھے تمہارے متعلق کچھ بتایا گیا ہے اس لیے بُلایا ہے۔ تمہیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ جسے تم دل سے چاہتی ہو اُس کا چہرہ تیزاب سے جلا دیا گیا ہے۔ اب تم اُسے پہچان

نہیں سکو گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے اندھا ہو گیا ہے۔ میں تمہاری اور زمان کی دوستی کے متعلق بہت کچھ جانتا ہوں۔"

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس نے کہا ــــ "مجھے پتہ چل گیا ہے۔"

"کس نے بتایا ہے؟"

اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے پھر پوچھا کہ کس نے بتایا ہے۔ اُس نے ایک ہندو کا نام لیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اُس نے سر جھکا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہندو کون ہے اور اُس کے ساتھ اُس کا کیا تعلق ہے۔ میں اس شک پر کام کر رہا تھا کہ اس واردات کا باعث رقابت ہے اور اس کا تعلق شیلا سے ہو سکتا ہے۔ شیلا جس ہندو کا نام لے رہی تھی وہ اُس کا دوست تھا۔

"اِس نے تمہیں کس طرح یعنی کن الفاظ میں بتایا تھا؟"

اُس نے کچھ وقت لگا کر اور بُری طرح جھینپتے ہوئے بتایا ــــ "اُس نے کہا تھا کہ اب بتاؤ وہ اچھا ہے یا میں؟ وہ مجھے زمان سے تعلق توڑنے کے لیے کہتا رہتا تھا۔ میں سمجھی کہ وہ اب بھی یہی کہہ رہا ہے۔ میں نے ویسے ہی کچھ جواب دے دیا تو اُس نے بتایا کہ زمان ہسپتال میں ہے کیونکہ اُس کے منہ پر کسی نے تیزاب پھینکا ہے ..... وہ اُسے ہسپتال میں دیکھ بھی آیا تھا۔ دو تین روز بعد اُس نے بتایا کہ زمان کا سارا چہرہ جل گیا ہے اور اُس کی آنکھیں بھی جل گئی ہیں۔"

"وہ خوش ہوگا۔"

"وہ بہت خوش" ــــ شیلا نے جواب دیا ــــ "لیکن میں خوش نہیں تھی۔"

"کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ زمان پر تیزاب اُسی نے پھینکا ہے؟"

"ہاں جی!" — اُس نے جواب دیا — "مجھے پہلا شک یہی ہُوا تھا۔ میں نے اُسے کہہ بھی دیا تھا۔ وہ بہت گھبرایا اور قسمیں کھانے لگا۔"

"کیا وہ اتنا دلیر ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اُس میں اتنی دلیری نہیں" — اُس نے کہا — "لیکن کوئی پاگل ہو جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اُس نے فلاں حرکت نہیں کی ہوگی۔"

لڑکی جب کھُل کر بولنے لگی تو مجھے احساس ہُوا کہ وہ ذہین ہے اور اس میں سادگی یا جھجک نہیں اور جس غلط طریقے سے وہ بیوگی گذار رہی ہے اسے وہ اپنا حق سمجھتی ہے۔ اُس کے بولنے کے انداز میں خود اعتمادی تھی، اور یہ خود اعتمادی مجھے کچھ اچھی لگ رہی تھی۔ اُس نے میرے دل میں اپنی ہمدردی پیدا کرلی۔ مجھے یہ اطمینان ہُوا کہ اس سے مجھے کوئی سراغ مل جائے گا۔

"اُس نے کبھی کوئی ایسی بات کی تھی کہ زمان کو قتل کردوں گا یا اس قسم کی کوئی اور دھمکی؟"

"ایسی باتیں تو وہ کرتا ہی رہتا تھا" — اُس نے کہا۔

"تم نے زمان کے ساتھ کبھی اس کی دھمکیوں کا ذکر کیا تھا؟"

"کیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "اُس نے دو تین بار کہا تھا کہ تم کہو تو اسے پار کردوں۔ میں نے اُسے روک دیا تھا۔"

"زمان بھی تمہیں کہتا ہوگا کہ اس سے تعلق توڑ لو۔"

"ہاں، اُس نے کہا تھا" — شیلا نے کہا — "لیکن وہ میری مجبوری سمجھتا تھا۔ زمان سے پہلے میری اُس کے ساتھ دوستی تھی جو میں توڑ دیتی تو وہ مجھے اور زمان

کو پکڑوا دیتا یا ہمارے راستے میں رُکاوٹ بن جاتا۔ میں نے اُس کی شرط مان لی تھی اور اُس سے یہ شرط منوالی تھی کہ میں زمان کی دوستی ترک نہیں کروں گی۔ زمان نے اس صورت کو قبول کر لیا تھا۔"

یہ کوئی سچّی محبّت والا معاملہ نہیں تھا۔ یہ تین گنا ہگاروں کا مسئلہ تھا۔ اگر گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو یہ ہندو مت کا معاملہ تھا لیکن میں اپنے مسئلے میں اُلجھا ہُوا تھا جو یہ تھا کہ جرم جو سرزد ہُوا ہے اس کا باعث شیلا ہے یا کوئی اور۔ مجھے نظر آنے لگا تھا کہ میرے مسئلے کا حل شیلا کے پاس ہے۔ اُس نے تعاون کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ میں نے بہت سی باتیں کہہ سُن کر اُس سے پوچھا کہ زمان کو وہ کس حد تک پسند کرتی تھی۔

اُس نے بڑا ہی صاف جواب دے کر مجھے حیران کر دیا۔ بلا جھجک کہنے لگی ــــ"سچ پوچھیے تو میں اُسے اپنا خاوند سمجھتی تھی۔ اُس نے مجھے تحفے پیش کیے، پیسے بھی دینے کی کوشش کی لیکن میں نے تحفے اور پیسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ ناراض ہُوا تو میں نے اُسے کہا کہ میں طوائف نہیں ہوں۔ میں نے اُسے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں مسلمان ہو جاؤں گی بشرطیکہ وہ میرے ساتھ شادی کرلے۔ اُس نے انکار نہیں کیا تھا۔ سوچ میں پڑ گیا تھا، پھر اُس نے کہا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ میں کرکے دکھا دوں گا۔"

"تم نے کبھی اپنے ہندو دوست سے کہا تھا کہ تم مسلمان ہو جاؤ گی؟"

"میں نے اُسے صرف یہی نہیں کہا تھا کہ میں مسلمان ہو جاؤں گی بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنے مذہب سے نفرت کرتی ہوں"ــــ شیلا کی آواز میں جوش

پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی ’’اُس نے کہا تھا کہ مسلمان ہو کر تم زمان کے ساتھ شادی کے خواب دیکھ رہی ہو۔ پھر اُس نے ہندو مذہب کی تعریفیں شروع کر دیں اور مسلمانوں کو پلید اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگا۔ میں نے اُسے کہا کہ پلید تم ہو اور پلید میں ہوں اور ہم دونوں کو ہمارے مذہب نے پلید کیا ہے۔ بیوہ کو کس گناہ کی سزا دی جاتی ہے؟ مجھ جیسی شکل والی نوجوان بیوہ کو منحوس کیوں سمجھا جاتا ہے؟ کیا اپنے خاوند کو میں نے قتل کیا ہے؟ میں نے اُسے کہا کہ تمہاری بہن اس جوانی کی عمر میں بیوہ ہو جائے گی تو تم اُسے متھرا یا دوارکا یا بنارس لے جا کر پنڈتوں اور سادھوؤں کے حوالے کر دو گے اور دل کو تسلی دے لو گے کہ وہ دوسری بیواؤں کے ساتھ مندر میں بیٹھی پرارتھنا کر رہی ہے، مگر کبھی وہاں جا کر یہ دیکھنے کی جرأت نہیں کرو گے کہ وہ پرارتھنا نہیں پاپ کر رہی ہے۔ تم اپنے پنڈتوں کو جانے کیا سمجھتے ہو؟ پنڈت پرارتھنا اور پاپ کو ایک مالا میں پرو کر رکھتے ہیں.....

’’اگر تم اُسے پنڈتوں کے حوالے یا کسی آشرم کے حوالے نہیں کرو گے تو وہ کوئی تم جیسا اور زمان جیسا ڈھونڈ لے گی۔ اس کھنڈر جیسے مکان بہت ہیں جہاں ہم ملا کرتے ہیں۔ میں نے اُسے کہا کہ تم آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو کہ تمہیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔ میں اپنے آپ کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتی۔ میں مذہب کا ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے مسلمانوں کا مذہب اچھا لگتا ہے جو عورت پر یہ ظلم نہیں کرتا...

’’میری اتنی زیادہ باتوں کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ وہ ہنس پڑا۔ وہ ایک نوجوان بیوہ کے جذبات کو سمجھتا ہی نہیں تھا۔‘‘

اُجڑا ہُوا ویران مکان

اس لڑکی کی زبان ایسی کھُلی کہ وہ چُپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بولتی ہی چلی جا رہی تھی۔ میں اُس سے اپنے مطلب کی باتیں سُننا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس کا ہندو دوست زمان کا اور زیادہ دشمن ہوگیا ہوگا۔

"اُسے ہونا ہی تھا" — شیلا نے جواب دیا — "اُس نے مجھے قتل تک کی دھمکی دے دی تھی۔ میں نے اُس کے جواب میں اُسے کہا تھا کہ میں اُس سے تعلق توڑ لوں گی اور وہ میرے خلاف جو کچھ بھی کرسکتا ہے کرلے۔ اس جواب سے وہ موم تو ہوگیا لیکن اُس کی نیّت پر مجھے شک رہا۔"

"وہ سفید شلوار قمیض اور زری جُوتی پہنتا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں" — شیلا نے یہ کہہ کر مجھے مایوس کردیا — "اُس نے شلوار اور زری جوتی کبھی نہیں پہنی۔ یہ مسلمانوں کا لباس ہے۔"

مجرم کی ایک نشانی اور بھی تھی جو میں نے شیلا کو نہ بتائی۔ یہ مجھے خود دیکھنی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اُس نے کرائے کا کوئی آدمی استعمال کیا ہو۔ ہندوؤں کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی مگر مجھے یہ خیال بھی آرہا تھا کہ ہندوؤں میں لڑائی مار کٹائی اور جرم کی جرأت ناپید تھی۔ میں شک کے باوجود مان نہیں سکتا تھا کہ ایک ہندو نے کسی پر تیزاب پھینکا ہو۔ یہ کسی حد تک تسلیم کیا جاسکتا تھا کہ ہندو نے اگر یہ جرأت کی ہے تو مجرم کرائے کا مسلمان ہوگا۔

میں نے شیلا سے پوچھا کہ زمان نے اپنی بیوی کے متعلق کبھی بات کی تھی؟
اُس نے جواب دیا کہ وہ اپنی بیوی کے خلاف بہت باتیں کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ اُسے حقیر سمجھتی ہے اور اُس کی پرواہ نہیں کرتی۔ زمان نے اپنی بیوی کو بتا دیا تھا کہ وہ شیلا کو چاہتا ہے۔ اور اُس کے ساتھ شادی کر کے اپنی بیوی کو بھی ساتھ رکھے گا۔ طلاق نہیں دے گا۔

میرے لیے یہ خبر بھی نئی اور کام کی بھی تھی۔ اُس کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان میں ایک بات اور میرے کام کی نکل آئی۔ جہاں مسلمانوں کا محلّہ ختم ہوتا تھا وہاں سے ہندوؤں کا محلّہ شروع ہو جاتا تھا۔ ان کے درمیان ایک قدیم مکان تھا جس کا کچھ حصّہ کھنڈر بن چکا تھا۔ آج کل آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ لوگ جھگیوں میں بھی رہتے ہیں۔ اُس زمانے میں مکان زیادہ اور انسان کم تھے۔ شہروں میں کہیں کہیں اُجڑے ہوئے غیر آباد مکان ہوتے تھے جن کے متعلق مشہور ہو جاتا تھا کہ آسیب زدہ ہیں۔ یہ مکان ایسا ہی تھا۔

شیلا نے بتایا کہ زمان کے ساتھ اُس کی ملاقاتیں راتوں کو اِس ویران مکان میں ہوا کرتی تھیں اور اسی مکان کے کسی کمرے میں جُوا چلتا تھا۔ زمان وہاں جُوا کھیلنے جایا کرتا تھا۔ میں نے جُوئے کے متعلق شیلا سے پوچھنا شروع کر دیا۔ اُسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ جُوا کھیلنے کون کون آیا کرتا تھا۔ زمان سے معلوم ہوا تھا کہ سینکڑوں (آج کل کے حساب سے ہزاروں) روپوں کی بازی لگتی ہے۔ زمان کئی بار ہارا اور کئی بار جیتا ہے۔ ایک دو بار جواریوں میں لڑائی بھی ہوئی تھی۔

کوئی زخم نہیں تھا

جُوئے بازی کا انکشاف ہُوا تو میرے سامنے ایک اور شک آگیا۔ ہارا ہُوا جواری بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ جواری جب لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو بُری طرح زخمی کرتے ہیں۔ جواری قتل بھی ہو جاتے ہیں۔ مجھے شک ہونے لگا کہ زمان پر تیزاب کسی جواری نے پھینکا ہو گا۔

اب میرا شک تین حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک شیلا کا ہندو دوست۔ دوسرا کوئی جواری اور تیسرا شک زمان کی بیوی پر تھا جسے میں نے ابھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ زمان کے ہاتھوں ستائی ہوئی تھی۔ ایسا امکان موجود تھا کہ اُس نے کسی کو پیسے دے کر زمان کے منہ پر تیزاب پھینکوایا ہو۔

شیلا کے بعد میں نے اُس کے ہندو دوست کو تھانے بلایا اور اس کے ساتھ ہی کبیر ناتھ سے پوچھا کہ اُسے معلوم ہے کہ اُس کے علاقے میں جُوئے بازی کا ایک خفیہ اڈا ہے؟ — اُسے معلوم نہیں تھا۔ میں مان نہیں سکتا تھا کہ اُسے معلوم نہ ہو۔ مخبر، ہیڈ چوکیدار اور کانسٹیبل تھانیداروں کو باخبر رکھتے تھے کہ علاقے میں کیا ہو رہا ہے۔ بعض تھانیدار جواریوں سے باقاعدہ فیس یا کمیشن لیا کرتے تھے۔ میں نے کبیر ناتھ سے پوچھ کر اُس مخبر کو بلایا جس کی ذمّہ داری میں جُوئے والے ویران مکان کا محلّہ تھا۔ چوکیدار کو بھی بُلایا۔

یہ دونوں آئے تو میں انہیں الگ لے گیا۔ دونوں سے الگ الگ پوچھا۔

میں ان سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کبیر ناتھ کو جُوئے کے اس اڈے کا علم تھا یا نہیں۔ پہلے تو دونوں نے کہا کہ انہیں خود بھی علم نہیں۔ وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ میں نے جب اپنا آپ دکھایا تو دونوں مان گئے۔ وہ جواریوں سے کمشن لیتے تھے اور دونوں نے علاقے کے تھانیدار کو بے خبر رکھا ہُوا تھا۔ اڈہ ایک سکھ چلاتا تھا۔ یہ سکھ پولیس کے ریکارڈ پر تھا۔ ہفتے میں دو تین راتیں وہاں جُوا ہوتا تھا۔ زمان کو وہ جانتے تھے۔ وہ باقاعدہ جُوا کھیلا کرتا تھا۔

میں نے اس سکھ کے علاوہ دو تین جواریوں کے نام پوچھ لیے اور کبیر ناتھ سے کہا کہ انہیں فوراً تھانے میں بلا لے۔ شیلا کا ہندو دوست آ چکا تھا۔ وہ تو خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اُس کا خوف دُور نہ کیا نہ اُس کے ساتھ دوستانہ لہجے میں بات کی۔ اُس کے نیچے سے میں زمین نکال لینا چاہتا تھا۔ وہ باہر برآمدے میں کھڑا تھا۔ میں نے اُس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور دھکیل کر کمرے میں لے گیا۔

"دیکھ اوئے لالے!" میں نے اُسے کہا۔ "فوراً مان لے کہ تُو نے زمان کے مُنہ پر تیزاب پھینکا ہے"۔

میں کن الفاظ میں بیان کروں کہ اُس کی کیا حالت ہوئی۔ اُس کا رنگ صاف ستھرا تھا جو لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ آنکھوں میں جوانی کی جو چمک تھی وہ بھی سفید ہو گئی اور لوگوں کے دانت بجا کرتے ہیں، اُس کے گھٹنے بجنے لگے۔ میں نے اس طرح کانپتا ہُوا آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑنے کے لیے اُوپر کیے لیکن اُس میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ ہاتھ اوپر کر کے جوڑ سکتا۔ وہ رو پڑا۔

اُس نے چُوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا جو اُتارنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے اُسے کہا کہ آزار بند کھول کر پاجامہ نیچے کر دو۔ وہ ڈر گیا اور سمجھا شاید میں ننگا کر کے اُسے بید ماروں گا۔ وہ گھٹنوں کے بَل گر پڑا اور میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور بڑی مشکل سے اُس سے پاجامہ نیچے کرایا۔ میں نے اُس کی دونوں رانیں دیکھیں۔ گھٹنوں سے نیچے تک ٹانگیں دیکھیں۔ کہیں کوئی زخم نہیں تھا۔

میں نے زری جوتی کا وہ پاؤں منگوایا جو تیزاب پھینکنے والا مجرم جائے واردات پر چھوڑ گیا تھا۔ میں نے اس ہندو کا پاؤں دیکھ کر ہی اندازہ کر لیا کہ جُوتی بڑی ہے۔ جُوتی میں اُس نے پاؤں ڈالا تو وہ دو انگلی بڑی نکلی۔

مجھے یہ تو یقین ہو گیا کہ تیزاب اُس نے نہیں پھینکا لیکن یہ شک ابھی باقی تھا کہ اُس نے کرائے کا کوئی آدمی استعمال کیا ہو گا۔ اُسے بٹھا لیا اور کہا کہ وہ آدمی بتا دے جس سے اُس نے زمان کے مُنہ پر تیزاب پھینکوایا ہے۔ اس کے جواب میں وہ ڈرے ہوئے بچّوں کی طرح رونے لگا۔ میں نے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا اور گرج کر کہا — "چُپ ہو جا" — وہ تو جیسے مر ہی گیا ہو۔

میں نے اُس سے شیلا کے متعلق پوچھنا شروع کیا تو اُس نے شیلا کی باتوں کی تصدیق کر دی۔ اُس نے تسلیم کیا کہ وہ شیلا کو دھمکیاں دیتا رہا ہے لیکن اُس میں اتنی ہمت نہیں کہ کسی پر کوئی وار کر سکے۔ زمان سے تو وہ ڈرتا بھی تھا۔ مختصر یہ کہ میں نے محسوس کیا کہ جُرم کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "میں آئندہ شیلا سے نہیں ملوں گا۔ اُس کی صورت نہیں دیکھوں گا۔"

اُس کے ساتھ کم وبیش تین گھنٹے صرف ہوئے۔ میں نے اُسے فارغ کر دیا لیکن اپنا ڈر اُس پر رہنے دیا۔

زمان اڈے پر جوا کھیلتا تھا

جوئے کا اڈہ چلانے والا سکھ آگیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرے اور مجھے چکر نہ دے ورنہ اُس کے لیے بہت بُرا ہوگا۔ وہ جرائم پیشہ تھا۔ اُس نے مجھے کوئی چکر نہ دیا۔ میرے گھٹنوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر بولا ”موتیاں والی سرکار، کسی طرح تو روزی کمانے دو۔ چوری تم نہیں کرنے دیتے۔ جیبیں تم نہیں کاٹنے دیتے۔ اب جُوا بھی نہیں کھیلنے دیتے.. اور سرکار! میں جوا کھیلتا نہیں کھلاتا ہوں۔ دو چار روپے ہاتھ آجاتے ہیں۔“

”تم جوجی میں آئے کرو خالصے!“ میں نے کہا۔ ”میں کبیر ناتھ کے آگے تمہاری سفارش کر دوں گا۔ میرا ایک کام کر دو۔ تفتیش پھنسی ہوئی ہے .... زمان کو جانتے ہو؟ تمہارے اڈے پر آیا کرتا ہے۔“

”جانتا ہوں موتیاں والیو!“ سکھ نے کہا۔ ”وہ ٹھیکیداروں کا بیٹا۔ کسی نے اُس کے مُنہ پر تیزاب ڈال کر اُس کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ کہتے ہیں اندھا ہو گیا ہے۔“

”دیکھ خالصے!“ میں نے کہا۔ ”تجھے معلوم ہے تیزاب کس نے پھینکا ہے؟“

”نہ سرکار!“ اُس نے کہا۔ ”معلوم ہوتا تو کبیر جی کو میں اُسی دن بتا دیتا۔“

ہم تمہاری جوتیوں کے نوکر ہیں۔ بازی پر اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔"
میں نے اُسے واردات کی رات یاد دلاتے ہُوئے پوچھا۔ "اُس رات وہ کھیلنے آیا تھا؟"
"وہ آیا تھا"۔ اُس نے جواب دیا۔ "وہیں سے اُٹھ کر گیا تھا۔"
"وہ کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہُوا تھا؟"۔ میں نے پوچھا۔ "وہ جیتا تھا یا ہارا تھا؟"
"وہ کسی کے ساتھ لڑائی نہیں ہوئی تھی"۔ اُس نے کہا۔ "وہ اتنی زیادہ رقم نہیں جیتا تھا کہ کوئی اُس پر اس طرح وار کرتا۔ میں تمہیں اُن سب کے نام بتا دیتا ہوں جو وہاں موجود تھے۔ اُن سے پوچھ لو۔"
"یاد کرکے بتاؤ کہ اُس رات تمہارے ساتھ کوئی ایسا آدمی تھا جس نے سفید شلوار قمیض پہنی ہو اور پاؤں میں زری جُوتی ہو؟"
"نہیں"۔ اُس نے جواب دیا۔ "ایسا کوئی نہیں تھا۔۔۔ میں اور میرے ساتھی اُس روز سے کھوج لگا رہے ہیں کہ تیزاب کس نے ڈالا ہے۔ ہم سب کو ایک ہندو لڑکی شیلا پر شک ہے۔ وہ زمان کو اسی مکان میں ملا کرتی تھی۔ اُس کے کسی اور چاہنے والے نے زمان پر تیزاب ڈالا ہے۔ یہ بھی سُنا ہے کہ لڑکی زمان کے سوا کسی اور سے بات تک نہیں کرتی۔"
اس سے میں نے اور بھی بہت کچھ پوچھا لیکن مجھے ماننا پڑا کہ ان لوگوں پر میرا شک غلط ہے۔ تھانے میں تین اور آدمی آگئے تھے جو جُوا کھیلا کرتے تھے۔ ان سے الگ الگ پُوچھ گچھ کی۔ سب کے بیان سکھ سے ملتے جلتے تھے۔ آخر

میں اُس مخبر سے بات ہوئی جو اس اڈے سے واقف تھا۔ اُسے ڈانٹ ڈپٹ کی کہ اُس نے علاقے کے تھانیدار کو اس اڈے سے بے خبر رکھا ہُوا ہے۔

"زمان کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟"

"وہ وہاں جُوا کھیلنے آیا کرتا تھا"۔ اُس نے جواب دیا ۔ "اور اسی مکان کے ایک کمرے میں ہندو لڑکی اس سے ملا کرتی تھی۔ اس لڑکی کو میں جانتا ہوں۔ اس کا دوستانہ ایک ہندو کے ساتھ بھی ہے۔ میں کسی تیسرے آدمی کو نہیں جانتا۔"

"جب یہ جُوا کھیلتے تھے تو تم ان کے لیے پہرے پر کھڑے رہتے تھے؟"

"جی ہاں"۔ اُس نے کہا ۔ "آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ میں گلی میں ٹہلتا رہتا تھا تاکہ کوئی گشت پر آجائے تو کھیلنے والوں کو خبردار کردوں یا گشت والے کو باتوں میں لگا کر مکان سے دُور لے جاؤں۔"

"جُوا کھیل کر جب سب نکلے تو تم نے سب کو جاتے دیکھا ہوگا"۔ میں نے کہا ۔ "زمان کدھر کو گیا تھا؟ ذرا یاد کر کے بتاؤ کہ کوئی آدمی اس کے پیچھے جاتا دیکھا تھا"

"میں نے واردات والی گلی دیکھی ہے"۔ اُس نے جواب دیا ۔ "زمان نے مجھے دو روپے دیے تھے اور وہ اس گلی کی طرف چلا گیا تھا۔ باقی سب اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ میں بھی اُدھر کو ہی چل پڑا جدھر زمان گیا تھا۔ ایک گلی سے میں دوسری طرف چلا گیا۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ لوگ سو گئے تھے۔ مجھے حوالدار اشرف خان ملا تھا۔ اسی تھانے کا حوالدار ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میں نے اُسے سلام کیا۔ وہ رُکا نہیں۔ ہنس کر سلام کا جواب دیا اور یہ کہہ کر آگے نکل گیا

کہ کس مار پر جا رہے ہو۔ میں نے کہا گھر جا رہا ہوں۔ اس کے سوا میں نے کوئی اور آدمی نہیں دیکھا۔ میں گلی سے ہوتا ہوا سڑک پر چلا گیا۔"

"جوا کھیلنے والوں میں اُس رات سفید شلوار قمیض میں کون تھا؟"— میں نے پوچھا— "کسی نے زری جُوتی پہن رکھی تھی؟"

اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی اور بولا— "جُوتی کا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سفید شلوار قمیض میں کوئی نہیں تھا"— اُس نے مجھ سے پوچھا— "کیا ملزم سفید شلوار قمیض میں تھا اور اُس نے زری جُوتی پہن رکھی تھی؟"

"ہاں!"— میں نے کہا— "مجھے یہی رپورٹ ملی ہے۔ وہ لمبے قد کا ہے۔"

وہ پولیس کا مخبر تھا اور چھوٹے موٹے جرم بھی کرتا رہتا تھا۔ وہ پولیس کے طور طریقوں اور تفتیش کی باریکیوں کو سمجھتا تھا۔

"اُس رات میں نے اس حلیئے کا ایک ہی آدمی دیکھا تھا"— اُس نے کہا— "لمبا قد، سفید شلوار اور قمیض اور پاؤں میں زری جُوتی.... وہ حوالدار اشرف خان تھا۔ وہ اُس گلی میں مُڑ گیا تھا جو آگے جا کر واردات والی گلی سے جا ملتی ہے۔"

"نہیں"— میں نے اکتاہٹ سے کہا— "ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ زمان کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ تیزاب پھینکنے والے کے ہاتھ میں بوتل یا ڈبہ وغیرہ ہونا چاہیئے تھا"

"اُس نے ہاتھ میں کچھ پکڑ رکھا تھا"— اُس نے کہا— "وہ مجھے جہاں ملا وہاں بجلی کا ایک بلب جل رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ مجھے دیکھ کر وہ رُکا کیوں نہیں۔ میرے اُس کے ساتھ اچھے خاصے تعلقات ہیں۔ وہ بہت تیز چلا

جا رہا تھا۔"

اس سے بھی مجھے کچھ نہ ملا تو میں نے اُسے چلے جانے کو کہا۔ وہ اُٹھا اور چل پڑا مگر رُک گیا اور التجا کے لہجے میں بولا۔ "میں نے اس اڈے کو کبیر صاحب سے خفیہ رکھا تھا۔ آپ میرے خلاف... کارروائی تو نہیں کریں گے؟ میری روزی کا ذریعہ یہی ہے۔"

"تم نے کام کی کوئی بات، تو بتائی نہیں" — میں نے مسکرا کر کہا۔ "میرا مسئلہ ویسے کا ویسا پڑا ہے.... جاؤ میں تمہاری سفارش کروں گا۔ تمہارے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔"

"تو اس مہربانی کے عوض ایک اور بات سن لیں" — اُس نے کہا۔ "شاید آپ کو اس سے کچھ فائدہ پہنچے۔ حوالدار اشرف خان کو میں نے سلام کیا تو وہ رُکا نہیں تھا بہت تیز چلتا آگے نکل گیا تھا۔ وہ رُک گیا اور مجھے آواز دی۔ میں دوڑا گیا۔ اُس نے کہا۔ 'کسی سے ذکر نہ کرنا کہ تم نے مجھے یہاں دیکھا تھا۔ اگر کسی کو بتایا تو یاد رکھو اندر کرا دوں گا' — اُس وقت میں نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ میں شیشے کا گلاس تھا جس میں پانی سا تھا۔ شاید شراب ہو۔"

"پھر سوچ لو" — میں نے اُسے کہا۔ "تمہارے دل میں کوئی اور بات ہے تو وہ بھی بتا دو۔ کیا اشرف خان اور زمان کی دوستی یا دشمنی ہے؟"

اُس نے قسمیں کھا کر کہا کہ اُسے اور کچھ پتہ نہیں۔

میرے سامنے اب ہیڈ کانسٹیبل اشرف خان آ گیا۔ دیکھنا یہ تھا کہ زمان کے ساتھ اشرف کی کیا دشمنی تھی، دشمنی تھی بھی یا نہیں۔

سفید شلوار قمیض، زری جوتی اور زخم

میں اشرف خان کو نہیں جانتا تھا۔ مُخبر کے جانے کے بعد میں نے کرم ناتھ سے پوچھا کہ اُس کا ہیڈ کانسٹیبل اشرف خان کیسا آدمی ہے اور اُس کے متعلق اُس کی کیا رائے ہے۔ اُس نے بتایا کہ اشرف خان زمیندار خاندان کا خوبرو جوان ہے۔ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے اور بہت ہوشیار اور چلتا پرزہ ہے۔ اس کا گذارہ تنخواہ سے نہیں ہوتا۔ شاید اِدھر اُدھر ہاتھ مار لیتا ہے اور ٹھاٹھ سے رہتا ہے۔ عام قسم کے ہیڈ کانسٹیبلوں سے بالکل مختلف ہے۔

مجھے ایسا شک نہ ہُوا کہ اُس نے زمان پر تیزاب پھینکا ہو گا لیکن اُس کے ساتھ بات کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ وہ جائے واردات کے قریب تھا اور مُخبر کی اطلاع کے مطابق وہ اُس گلی میں چلا گیا تھا جو آگے جا کر واردات والی گلی سے ملتی تھی۔ واردات کا وقت تقریباً یہی تھا۔ اُس نے شور شرابا سُنا ہو گا۔ میں نے اُسے بُلایا۔ وہ واقعی خوبرو جوان تھا۔ اُس کا قد لمبا اور بڑا اچھا تھا۔

"واردات کی رات بلکہ واردات کے وقت تم جائے واردات کے قریب دیکھے گئے تھے" — میں نے اُس سے پوچھا — "کیا تم نے کوئی شور شرابہ سُنا تھا؟ کسی کو بھاگتے دیکھا تھا؟"

"آپ کو غلط رپورٹ ملی ہے" — اُس نے کہا — "میں اُدھر نہیں گیا۔"

"کیا تمہارے ہاتھ میں شیشے کا گلاس نہیں تھا؟"

اُس کے چہرے پر گھبراہٹ آ گئی۔

"اشرف خان! جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "تم یہ بھی جانتے ہو کہ ویران مکان میں نامی گرامی جوئے باز اور رجسٹرڈ بدمعاش اکٹھے ہوتے ہیں۔"

"مجھے معلوم نہیں جناب!"

"کیا تم نے سفید شلوار اور سفید قمیض نہیں پہن رکھی تھی؟" میں نے غصے سے پوچھا۔ "کیا تمہارے پاؤں میں زری جوتی نہیں تھی؟"

کبیر ناتھ نے مجھے بتایا تھا کہ اشرف خان ذہین اور ہوشیار ہیڈ کانسٹیبل ہے لیکن وہ مجھے کچھ اور نظر آیا سو وہ احمق تھا یا ڈھیٹ۔ مجھے یقین تھا کہ مخبر نے جھوٹ نہیں بولا۔ اشرف خان جھوٹ بول رہا تھا۔ اُس نے میرے سوال کا جواب اُلٹا سا دیا۔ اُس زمانے میں پولیس والے نیکر پہنا کرتے تھے۔ مجھے کچھ شک سا ہوا۔ اشرف خان کی نیکر گھٹنوں تک تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ نیکر اُوپر کر کے دونوں رانیں ننگی کر دے۔

"جناب!" اُس نے ہنس کر کہا۔ "آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ آپ نے مجھے مشتبہ سمجھ لیا ہے؟"

میں نے گرج کر کہا۔ "دونوں رانیں ننگی کر دو۔ نیکر اُوپر اُٹھاؤ۔"

اُس نے کوئی حرکت نہ کی۔ کبیر ناتھ میرے پاس کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور غصے سے یہ کہہ کر کہ ذلیل انسان، تو حکم کیوں نہیں مانتا، اُس کی نیکر کے دونوں پائنچے اُوپر کر دیے۔ اُس کی دائیں ران پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے زری جوتی

کا پاؤں پاس رکھا ہُوا تھا۔ وہ اشرف خان کی طرف پھینک کر کہا بوٹ اُتار دو اور یہ پہنو۔

اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ جُرم ایسی چیز ہے جو انسان کی عقل مار دیتی ہے۔ اشرف خان بُوٹ اُتارنے سے جھجک رہا تھا۔ آخر اُس نے بُوٹ اُتارا اور جُوتی میں پاؤں ڈالا۔ جوتی اُسے فِٹ آ گئی۔

"جوتی کا دوسرا پاؤں کہاں ہے؟"

"یہ جوتی میری نہیں جناب!" اُس نے کہا۔

"یہ زخم کیسے آیا ہے؟"

"ایک روز پاؤں پھسلا تو میں گر پڑا"۔ اُس نے جواب دیا۔ "نیچے لوہے کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس سے ران کٹ گئی۔"

"پٹی کس سے کرا رہے ہو؟"

اُس نے ایک ڈسپنسر کا نام لیا۔ میں نے کبیر ناتھ سے کہا کہ اس ڈسپنسر کو فوراً تھانے بلاؤ۔ اُس نے ایک کانسٹیبل کو دوڑا دیا۔ اشرف خان کے متعلق پوچھا کہ کہاں رہتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ پہلے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ تین چار مہینوں سے تھانے کے ایک کمرے میں رہتا ہے۔ میں اُس کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلا گیا اور اُسے کہا کہ صندوق اور بکس کھولو۔ کبیر ناتھ ساتھ تھا۔ اُس نے صندوق اور بکس کھول دیے۔

لکڑی کے بکس سے زری جوتی کا ایک پاؤں برآمد ہُوا۔ میں نے وہ اس پاؤں کے ساتھ رکھا جو جائے واردات سے برآمد ہُوا تھا تو جوتی مکمل ہو گئی۔ دونوں

میں بال برابر فرق نہیں تھا۔

"اشرف خان!" میں نے تحمل سے کہا۔ "اقبالی بیان دو گے؟"

وہ ہنس پڑا۔ یہ ہنسی طنزیہ تھی۔ کہنے لگا۔ "جناب! پندرہ سال سروس ہو گئی ہے۔ میں کوئی بیان نہیں دوں گا۔"

میں نے اور کبیر ناتھ نے اُس کے تمام کپڑے نکال کر دیکھے۔ ایک سفید شلوار برآمد ہوئی جو اُس جگہ سے پھٹی ہوئی تھی جہاں ران پر زخم تھا۔ یہ دھوبی کی دُھلی ہوئی تھی۔ میں نے دھوبی کا نشان دیکھا۔ اشرف خان سے پوچھا کہ یہ کس دھوبی کی دُھلی ہوئی ہے؟

"میں کسی ایک بھی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔" اُس نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔

میں نے کبیر ناتھ سے کہا کہ ملازموں (تھانے کے سٹاف) کے کپڑے دھونے والے دھوبی کو بلواؤ اور اسے (اشرف خان کو) حوالات میں بند کر دو۔

شلوار خون سے لال تھی

ڈسپنسر آ گیا اور دھوبی کو بھی بلا لیا گیا۔ میں نے ڈسپنسر سے پوچھا کہ اُس نے ہیڈ کانسٹیبل اشرف خان کی پہلی پٹی کب کی تھی۔ ڈسپنسر میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا پھر اُس نے کبیر ناتھ کی طرف دیکھا جیسے وہ صحیح جواب دینے سے ڈر رہا ہو۔

"بولو بھائی!" میں نے اُسے کندھے سے جھنجھوڑ کر کہا۔ "میں نے

کیا پوچھا ہے ؟"

اُس نے سوچ کر ایک رات بتائی جو تقریباً واردات کی رات تھی۔ وقت گیارہ بجے کا بتایا۔ اشرف خان نے اُسے گھر سے جگایا تھا اور کہا تھا کہ اُس کی لڑائی ہوگئی ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کسی کو پتہ چلے اس لیے وہ اُس کی پٹی کر کے کسی کو بتائے نہیں۔ میں نے ڈسپنسر سے کہا کہ اشرف خان نے بہت بڑا جرم کیا ہے اس لیے وہ سب کچھ بتا دے کہ اشرف خان کے کپڑوں کی کیا حالت تھی وغیرہ۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ اُس نے کوئی بات چھپائی تو اُسے اعانتِ جرم میں گرفتار کر لیا جائے گا۔

اس ہندو نے اپنی چھوٹی سی ڈسپنسری کھول رکھی تھی۔ وہ کچھ چھپانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو وہ بتا چکا تھا کہ اشرف خان نے اُسے کہا تھا کہ کسی کے ساتھ لڑائی ہوگئی ہے۔ اُس نے مزید بتایا کہ اُس کی شلوار خون سے لال تھی اور دوسری ٹانگ سے شلوار پر زمین کی رگڑ تھی۔ اُس کے پاؤں میں ایک ہی جوتی تھی جو زری تھی۔ دوسرے پاؤں سے وہ ننگا تھا۔ شلوار قمیض سفید تھی۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ اشرف خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ اس ڈسپنسر کے پاس دوائی لینے جایا کرتا تھا۔

سترہ اٹھارہ دن ہوگئے تھے۔ ڈسپنسر ابھی تک اُس کا زخم ٹھیک نہیں کر سکا تھا۔ ڈسپنسر نے بتایا کہ زخم گہرا بھی ہے اور ترچھا ٹیڑھا سا بھی۔ میں نے برچھی کی وہ اُکھڑی ہوئی پتری دیکھی تھی جو اشرف خان کو لگی تھی۔ خاصی موٹی تھی اور تقریباً ڈیڑھ انچ چوڑی تھی۔ اشرف خان ابھی تک ڈسپنسر سے پٹی کرا رہا تھا۔

ایک تو یہ ہمارا گواہ ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ دھوبی آگیا ہے۔ ڈسپنسر کو فارغ کر کے میں نے دھوبی کو بلایا۔ وہ بھی کچھ بتانے سے ڈرتا تھا۔ جب میں نے اُس پر اپنا ڈر سوار کیا تو اُس نے بتایا کہ سترہ اٹھارہ روز گزرے، حوالدار اشرف خان نے آدھی رات کو اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دھوبی باہر نکلا تو لالٹین کی روشنی میں اُس نے اشرف خان کو دیکھا۔ اُس کی شلوار خون سے لال تھی۔ اشرف خان نے اُسے کہا کہ وہ کسی کی شلوار قمیض اُسے دے دے اور اُس کی شلوار قمیض فوراً بھٹی چڑھا دے لیکن کسی کو پتہ نہ چلے۔ اُس نے دھوبی کو بہت ڈرایا۔

دھوبی نے اُسے کسی کے استری کیے ہوئے کپڑوں میں سے شلوار قمیض نکال دی جو اُس نے پہن لی۔ صبح ہوتے ہی اشرف خان کپڑے واپس کر گیا۔ دھوبی نے اُس کی شلوار قمیض رات کو ہی پانی میں ڈال دی تھی تاکہ خون کے داغ پکے نہ ہو جائیں۔

میں نے یہ شلوار قمیض جو اشرف خان کے صندوق سے برآمد کی تھی، دھوبی کو دکھائی۔ شلوار ران سے پھٹی ہوئی تھی۔ وہاں سے پتری ران میں اُتری تھی۔ دھوبی نے شلوار پہچان لی۔

انسانی فطرت، ایک عجوبہ

میں نے کیسر ناتھ سے کہا کہ واردات کی رات تھانے میں زمان کو رڑھی پر لایا گیا تھا۔ تھانے میں ہلچل مچی ہوگی۔ کاغذی کارروائی ہوئی تھی۔ مضروب کو ہسپتال لے جانے کا مسئلہ پیدا ہوا تھا۔ کیا اُس نے دیکھا نہیں کہ ہیڈ کانسٹیبل

اشرف خان تھانے سے غیر حاضر تھا؟ کسی نے یہ تو دیکھا ہوگا کہ وہ آدھی رات کے بعد واپس آیا تھا۔

کبیر ناتھ نے بتایا کہ اُس نے اشرف خان کے متعلق پوچھا تھا کہ کہاں ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ فلم دیکھنے گیا ہے۔ وہ چونکہ خود سر آدمی ہے، اس لیے اُس نے کبیر ناتھ سے جانے کی اجازت نہ لی، بہرحال تمام سٹاف سے پوچھا گیا تو دو کانسٹیبلوں نے اُسے بتایا کہ اشرف خان آدھی رات کو پچھلی طرف سے تھانے میں آیا تھا اور اُس نے وہ کپڑے نہیں پہن رکھے تھے جو وہ پہن کر تھانے سے نکلا تھا۔ اُس کے ایک پاؤں میں جُوتی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ کیچڑ سے پھسل کر گر پڑا تھا۔ کپڑے خراب ہو گئے اور ایک جوتی ٹوٹ گئی ہے اور وہ ایک دوست کے کپڑے پہن کر واپس آیا ہے۔

اب شک وشبہ کی گنجائش نہ رہی۔ تیزاب ہیڈ کانسٹیبل اشرف خان نے ہی پھینکا تھا مگر اُس نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے اُس کے اقبالی بیان کی ضرورت تھی۔ مقدمہ تیار کرنا تھا۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ اُس کی زمان کے ساتھ کیا دشمنی تھی۔ اقبالی بیان کے بغیر بھی میں مضبوط مقدمہ تیار کر سکتا تھا۔ تھانیداروں کو اکثر خانہ پُری کرنی پڑتی ہے۔ وہ میں بھی کر سکتا تھا جو میں نے کی بھی تھی۔ یہ تو یقین ہو چکا تھا کہ مجرم یہی ہے، چنانچہ میری کوشش یہ تھی کہ شہادت کی کمی کے باعث یہ بری نہ ہو جائے۔ اشرف خان کو موقعۂ واردات پر کسی نے نہیں پہچانا تھا۔ ریڑھی والے دونوں آدمیوں نے کہا تھا کہ وہ مجرم کو نہیں پہچان سکے کیونکہ اُس کا چہرہ پگڑی میں چھپا ہُوا تھا اور روشنی بھی تھوڑی تھی۔

ملزم کی شناخت کا ایک قانونی طریقہ ہوتا ہے۔ اُسے دس بارہ آدمیوں میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ایک مجسٹریٹ موجود ہوتا ہے۔ موقعے کے گواہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ ملزم کو پہچانے۔ اسے شناخت پریڈ کہتے ہیں۔ میں نے بھی شناخت کا یہی طریقہ اختیار رکھا تھا لیکن غیر قانونی حرکت یہ کی کہ ریڑھی والے دونوں آدمیوں کو تھانے بُلا کر انہیں اشرف خان دکھا دیا تھا۔ شناخت پریڈ میں انہوں نے اُسے فوراً شناخت کر لیا تھا۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا تھا کہ عدالت میں اپنے بیانوں میں یہ نہ کہیں کہ ملزم کا چہرہ پگڑی میں چھپا ہُوا تھا۔

میں نے اشرف خان کو حوالات سے نکلوا کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اونچے اور خوشحال زمیندار گھرانے کا آدمی تھا۔ اُس دور میں پولیس حوالدار کی بڑی شان ہُوا کرتی تھی۔ اشرف خان تو اور زیادہ شاندار حوالدار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے بڑے مالدار گھرانے میں دشمنی اور دوستی لگائی تھی۔ اُس کے چہرے مہرے اور قد بُت میں بہت کشش تھی۔

"اشرف خان!" میں نے اُسے دوستانہ لہجے میں کہا "تم نے چوری نہیں کی۔ مردوں والا کام کیا ہے۔ اب مردوں والا ایک کام اور کر دو.... اقبالی بیان دے دو"

"بیان نہ دوں تو؟"

"اپنے دل کے بادشاہ ہو" میں نے کہا "تم مجھے نہیں جانتے۔ میں نے ملزم پر کبھی ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ اس کے بغیر ہی اقبالی بیان لے لیا کرتا ہوں اور ملزم کو جس قدر فائدہ دلا سکتا ہوں، عدالت میں دلا دیتا ہوں۔ خدا گواہ ہے اشرف!

میں نے اقبالی بیان لے کر بھی بعض ملزم بری کرائے ہیں۔ اگر تم بیان زیر دفعہ ۱۶۴ دے دو گے تو فائدے میں رہو گے۔ میں احسان کا کچھ بدلہ تو ضرور دوں گا۔ اگر نہیں دو گے تو سوچ لو میں علاقے کا تھانے دار نہیں، سی۔ آئی۔ اے کا انسپکٹر ہوں۔ تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور وہاں گورے انسپکٹر ہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ سی۔ آئی۔ اے کو ڈرلی جیجھہ کہا کرتے ہیں اور کیوں کہا کرتے ہیں۔"

"آپ مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کریں"۔ اُس نے کہا۔ "میں آپ کے خوف سے کوئی بات نہیں کروں گا۔"

"اور تم مجھے للکارنے کی کوشش نہ کرنا"۔ میں نے کہا۔ "میں اپنا کیس خراب نہیں کروں گا۔ سوچ لو۔ خاندانی آدمی ہو۔ مجھ سے اپنی عزّت کراؤ۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میرے پاس شہادت مکمّل ہو گئی ہے۔ تم پولیس میں اتنی زیادہ سروس کر چکے ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ شہادت کے خالی خانے کس طرح پورے کیے جاتے ہیں۔ تم جس ریڑھی سے ٹکرا کر زخمی ہوئے تھے، اس کے ساتھ دو آدمی تھے جنہوں نے تمہیں پکڑ لیا تھا اور تم نکل گئے تھے۔ دونوں تمہیں پہچانتے ہیں۔ اس خیال میں نہ رہنا کہ تم نے منہ صافے میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے انہیں تمہارا منہ دکھا دیا ہے... اگر کیس لڑنے کی سوچ رہے ہو تو کبیر ناتھ سے پوچھ لینا کہ میں اپنا کیس کس طرح لڑا کرتا ہوں۔"

چند اور مکالموں کے بعد (جن میں بعض آج کل کی پنجابی فلموں جیسے تھے اور کچھ پرانے زمانے کی اُردو فلموں جیسے پیارے پیارے) اشرف خان اقبالی بیان دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اور میں نے ایک ایسی کہانی سُنی جس سے پتہ چلتا ہے

ہے کہ انسانی فطرت ایک عجوبہ ہے۔

کالا بُرقعہ عشق محبت انگریزی فلموں جیسا

میں یہ کہانی اپنے انداز سے مختصر کرکے آپ کو سناتا ہوں۔

اس واردات سے چار ماہ پہلے کا واقعہ ہے اشرف خان ایک ڈیوٹی پر سائیکل پر گیا۔ واپس آتے اُس کا گزر ہمایوں کے مقبرے کے قریب سے ہُوا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ سیر سپاٹے کے خیال سے مقبرے کے اندر چلا گیا۔ ہمایوں کا مقبرہ وسیع علاقے میں پھیلا ہُوا ہے اور اس کے بے شمار کمرے ہیں۔ شام کا وقت تھا اس لیے وہاں بہت کم لوگ تھے۔ اشرف خان ٹہلتے ٹہلتے اُس طرف چلا گیا جدھر کم ہی لوگ جاتے ہیں۔ اُس نے دُور سے ایک مرد اور ایک عورت کو دیکھا جو انگریزی فلموں جیسے عشق و محبت میں مگن تھے۔ عورت کالے بُرقعے میں تھی۔

ایسی حرکات کا سرِعام ارتکاب جرم ہے۔ اشرف خان اُن کی طرف چلا گیا مگر قانون کے احترام کی خاطر اُدھر نہ گیا بلکہ ایک شکار کی خاطر گیا۔ وہاں درخت بھی تھے اور جھاڑ کی باڑ بھی تھی۔ ان سے گزرتے وہ جوڑا اُن کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اشرف خان جب اوٹ سے نکلا تو دیکھا کہ مرد غائب ہے اور عورت تیز تیز چلی جا رہی ہے۔ اشرف خان وردی میں تھا۔ اُس نے عورت کو رُک جانے کو کہا اور اُس کے پیچھے بہت تیز چل پڑا۔ اُسے وہ بازاری عورت سمجھا۔ وہ نہ رُکی۔ اشرف خان نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔

اُس نے دیکھا کہ وہ نوجوان لڑکی ہے اور بہت خوبصورت چہرے اور لباس سے وہ کسی امیر گھرانے کی لگتی تھی۔ اشرف خان نے اُس سے پوچھا کہ جو اُس کے ساتھ تھا وہ کہاں ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ چلا گیا ہے۔ لڑکی بڑی سخت گھبرائی۔ اشرف خان نے اُسے کہا کہ اگر وہ اُس کا خاوند نہیں تھا تو دونوں جرم کر رہے تھے اس لیے لڑکی کو تھانے چلنا پڑے گا۔ پولیس اس کے وارثوں کو اطلاع دے گی۔ وہ اُسے ضمانت پر رہا کرائیں گے اور کیس عدالت میں جائے گا جہاں سے لڑکی کو سزا ملے گی اور اُسے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ اُس کے ساتھ کون آدمی تھا۔ اگر نہیں بتائے گی تو اس کی الگ سزا ملے گی۔ لڑکی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

اشرف خان نے اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکال لینے کے لیے یہ بھی کہا کہ اُس پر غیر قانونی عصمت فروشی کے الزام میں مقدمہ چلے گا۔ لڑکی کو چکر آ گیا اور وہ گرنے لگی۔ اشرف خان نے اُسے بازوؤں میں تھام لیا۔ وہ وردی میں تھا اور ہیڈ کانسٹیبل بھی تھا، اس لیے اُسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ اُس نے لڑکی کو بازوؤں پر اٹھایا اور ایک کمرے کے باہر لٹا دیا۔ شام ہو چکی تھی۔ ایک آدمی نظر آیا۔ اشرف خان نے اُسے بُلا کر کہا کہیں سے ایک گلاس پانی لے آؤ۔

پانی آ گیا۔ لڑکی ہوش میں آ رہی تھی۔ اشرف خان نے اُسے پانی پلایا اور کہا کہ ڈرو نہیں میں مسلمان ہوں۔ کالا برقعہ نشانی تھی کہ لڑکی مسلمان ہے۔ پانی لانے والے کو اشرف خان نے بھگا دیا۔ لڑکی رونے لگی۔ اُس نے اشرف خان کی منّت سماجت کی کہ وہ اُسے جانے دے۔ اشرف خان نے پہلے تو پولیس کا رُعب جاری رکھا پھر اُس پر یہ ظاہر کرنے لگا کہ اُسے اُس پر رحم آ رہا ہے لیکن وہ اپنی ڈیوٹی

سے مجبور ہے۔ اس طرح اُس نے لڑکی کو اتنا رام کر لیا کہ وہ اُس کے اشاروں پر ناچنے کو تیار ہو گئی۔

آسمان سے گری کھجور میں اٹکی

اُس نے لڑکی سے پوچھا کہ اُس کے ساتھ کون تھا۔ لڑکی نے دانت پیس کر کہا کہ وہ بزدل اور کمینہ آدمی ہے۔ وہ اپنے خاوند کو دھوکہ دے کر اور اپنے ماں باپ سے جھوٹ بول کر کہ ایک سہیلی سے ملنے جا رہی ہے، اس آدمی سے ملنے یہاں آئی تھی۔ وہ اُسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

اشرف خان کے اس وعدے پر کہ وہ اُسے گھر چھوڑ آئے گا، لڑکی نے اُسے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ وہ زمان کی بیوی تھی۔ اُس نے جب زمان کا نام پتہ بتایا تو اشرف خان نے کہا کہ وہ زمان کو بہت اچھی طرح جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اُس کے تعلقات ایک ہندو لڑکی کے ساتھ ہیں اور وہ جُوا بھی کھیلتا ہے۔

لڑکی نے اشرف خان کی ٹھوڑی تھام کر التجا کی کہ وہ زمان کو پتہ نہ چلنے دے اشرف خان نے اُس سے پوچھا کہ وہ زمان جیسے خوبصورت جوان کو پسند نہیں کرتی؟ لڑکی نے اُسے بتایا کہ زمان اُس کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ اُسے طعنے دیتا رہتا ہے کہ اُس نے اُسے خریدا ہے۔ میں آپ کو لڑکی کے ساتھ زمان کا جو سلوک سُنا چکا ہوں، وہ لڑکی نے اشرف خان کو سُنا دیا اور کہا کہ اُس کے دل میں زمان کے لیے صرف نفرت ہے۔ یہ جو اُس کے ساتھ تھا اُس کی برادری کا ایک شادی شدہ جوان سال آدمی

تھا۔ لڑکی نے زمان سے انتقام لینے کی خاطر اس آدمی کے ساتھ دوستی کرلی تھی۔ اس آدمی نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زمان سے طلاق لے لے تو وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر اُس کے ساتھ شادی کرلے گا۔

یہاں میں اپنی رائے ایک بار پھر دے دوں۔ یہ پورا خاندان دولت کی فراوانی اور انگریزوں کی چاپلوسی کی وجہ سے اونچا تھا۔ ذہنی طور پر یہ لوگ پست تھے۔ دولت انسان کی شخصیت اور کردار کو بہتر نہیں بنا سکتی۔ اس کی نشوونما اور بہتری کو روک دیتی ہے۔ میں اس لڑکی کو مظلوم نہیں کہوں گا۔ وہ بھی اپنے خاندان اور زمان کی طرح اوچھے پن پہ اُتر آئی تھی۔ اُن کے ہاں محبّت اور نفرت کا تصوّر کچھ اور تھا۔ وہ اونچے چوباروں محل جیسی حویلی، زیورات، قیمتی اور بھڑکیلے لباس کو شخصیت سمجھتے تھے۔ اُن کے ہاں تعلیم بھی نہیں تھی۔ مرد تھوڑا تھوڑا پڑھے لکھے تھے۔ عورتیں اَن پڑھ تھیں۔ میں یہ بات تو بہت ہی پُرانی سُنا رہا ہوں لیکن پاکستان میں ایسی شخصیتیں عام پائی جاتی ہیں۔ سمندر پار کا پیسہ اس قسم کی شخصیتوں میں اضافہ کر رہا ہے۔

لڑکی نے اشرف خان کو بتایا کہ انتقام کے علاوہ وہ جذبات کے ہاتھوں مجبور ہوگئی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اُسے کوئی دل سے چاہے اور وہ محبّت کے نشے سے سرشار ہو۔ اشرف خان نے اُسے کہا کہ اُس نے محبت کے لیے ایسا آدمی تلاش کیا ہے جو آگ اور سمندر میں کُود جانے کی بجائے ایک پولیس حوالدار کو دیکھ کر بھاگ گیا ہے۔ کیا اب بھی وہ اُسے چاہے گی؟ لڑکی نے نفرت سے کہا کہ اُس پر وہ سَو لعنت بھیجے گی۔

اشرف خان نے اُسے بتایا کہ اُسے وہ صرف حوالدار نہ سمجھے۔ وہ امیر کبیر

زمیندار کا بیٹا اور بہت بڑی جائیداد کا وارث ہے۔ اشرف خان جوان بھی تھا اور خوبصورت بھی۔ اُس نے لڑکی سے محبّت کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اُسے بتائے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے لڑکی سے کہا کہ ایک عورت کے ذریعے وہ اُسے پیغام بھیجا کرے گا اور وہ آجایا کرے۔ اگر اُس نے ٹال مٹول کی تو وہ زمان کو اور اُس کے ماں باپ کو بتا دے گا کہ اُس نے لڑکی کو کہاں پکڑا تھا اور وہ انہیں کچھ غلط باتیں بھی بتائے گا۔

اُس زمانے میں بلیک میل کا لفظ عام نہیں تھا۔ اشرف نے یہ لفظ جانے بغیر لڑکی کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ وہ اُسے تانگے پر بٹھا کر اُس کے گھر کو لے چلا۔ خود سائیکل پر تھا۔ وہ لڑکی کے گھر سے کچھ دُور رُک گیا۔ اُس نے لڑکی کو اگلی ملاقات کا دن، وقت اور جگہ بتا دی تھی۔

حُسن اور دولت کے غرور کی سزا

لڑکی آگئی۔ وہ اشرف خان کو پہچان نہ سکی۔ وہ اب وردی میں نہیں بلکہ اُس وقت کے بڑے اچھے کپڑوں میں تھا۔ لڑکی اُس سے ڈری ہوئی تھی لیکن اشرف خان اُستاد کھلاڑی تھا۔ اُس نے لڑکی کے دل میں ڈر کی جگہ محبت پیدا کر لی۔ اس ملاقات کے بعد سات آٹھ دن کے وقفے سے اُن کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لڑکی اشرف خان کو بتاتی رہتی تھی کہ اُس کے ساتھ زمان کا سلوک بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ زمان نے اُسے جلانے کے لیے یہ بھی کہنا شروع کر دیا تھا کہ ایک ہندو لڑکی کے ساتھ اُس

کی دوستی ہے اور وہ اُس پر مرتی ہے۔ زمان کی بیوی نے اپنی ماں کو جو باتیں نہیں بتائی تھیں وہ اشرف خان کو بتاتی رہی۔ مثلاً زمان اور بیوی کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہو گئے تھے کہ وہ برائے نام میاں بیوی رہ گئے تھے۔ زمان اُس سے نفرت کا کھُلم کھلا اظہار کرتا تھا۔

وہ جوں جوں نفرت کا اظہار کرتا تھا لڑکی اتنی ہی اشرف خان میں سماتی چلی جا رہی تھی۔ آخر ایک روز زمان نے اُسے کہا کہ ہندو لڑکی اُس کی خاطر مسلمان ہونے کو تیار ہے اور وہ اُس کے ساتھ شادی کرے گا۔ زمان نے بیوی سے کہا کہ وہ اُسے طلاق نہیں دے گا بلکہ سوکن کو گھر میں لا کر اُس کے ساتھ رکھے گا۔

لڑکی کو زمان کی یہ بات بہت بُری لگتی تھی کہ وہ اپنے مردانہ حُسن کا اٹھتے بیٹھتے ذکر کرتا اور بیوی کو اپنے مقابلے میں بدصورت کہتا تھا۔ اُس کی بیوی کے سینے میں نفرت اور طعنوں کا جو غبار بھرتا جا رہا تھا، وہ انتقام کی آگ کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اگر وہ اکیلی ہوتی تو خودکشی کر لیتی یا روتی کُڑھتی رہتی۔ اُسے اشرف خان مل گیا تھا۔ وہ اس کے دل میں زمان کے خلاف نفرت کو بڑھاتا رہا اور اُسے انتقام کے طریقے بتاتا رہا۔

ایک شام لڑکی نے اشرف خان کو اُس عورت کی وساطت سے بُلایا جو اشرف خان نے مقرر کر رکھی تھی۔ یہ ملاقات شاہی قلعے میں ہوئی۔ لڑکی بہت روئی اور کہنے لگی کہ وہ زمان سے اس قدر تنگ آ گئی ہے کہ زہر کھا کر مر جائے گی مگر وہ زمان سے ایسا انتقام لینا چاہتی ہے کہ وہ زندہ رہے اور ساری عمر یاد رکھے۔ اُسے زمان نے اپنی اور ہندو لڑکی کی فوٹو دکھائی تھی۔ دونوں بڑی ہی بیہودہ پوزیشن میں تھے۔ زمان کی بیوی کے لیے یہ چوٹ ناقابلِ برداشت تھی۔

بیوی کتنی ہی شریف، کتنی ہی بے بس اور بے سہارا کیوں نہ ہو، وہ خاوند کا ایسا سلوک برداشت نہیں کر سکتی۔ بعض خاوند بیویوں کو ذرا ذرا سی باتوں پر ٹوکتے رہتے ہیں اور اُن پر اپنی ڈکٹیٹر شپ ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے خاوند بیویوں کی نظروں میں گر جاتے ہیں۔ وہ بیویاں ایسے ہی خاوندوں کی ہوتی ہیں جو اپنی پسند کے مردوں سے آشنائی کر لیتی ہیں۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے جو اپنے آپ کو پورا کرا لیتا ہے۔

شاہی قلعے کی اس ملاقات میں زمان کی بیوی دانت پیس پیس کر زمان سے انتقام لینے کی باتیں کرتی رہی۔ اشرف خان نے تجویز پیش کی کہ زمان کے چہرے پر تیزاب پھینکا جائے اور جب اُس کے زخم ٹھیک ہو جائیں اور پولیس کی تفتیش ختم ہو جائے تو اُس کی بیوی اُس پر طعنوں کے تیر چلانے شروع کر دے۔ لڑکی کو یہ تجویز پسند آئی لیکن سوال یہ تھا کہ تیزاب کون پھینکے اور کہاں پھینکے۔ اشرف خان کرائے کے کسی آدمی سے یہ کام کرانے کی کہہ رہا تھا لیکن خود ہی کہنے لگا کہ کرائے کا آدمی دھوکہ بھی دے سکتا ہے۔

لڑکی نے اشرف خان سے کہا کہ وہ خود یہ کام کرے۔ اُس نے اشرف خان کو یاد دلایا کہ اُس نے لڑکی سے کہا تھا کہ وہ محبت کے لیے ایسا مرد تلاش کرے جو آگ اور سمندر میں کود جائے۔ لڑکی نے اشرف خان کی مردانگی کو ایسے انداز سے للکارا کہ وہ زمان کے منہ پر تیزاب پھینکنے کو تیار ہو گیا۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے انتقام کی آگ سرد کر دے تو وہ زمان سے طلاق لے کر اُس کے پاس آ جائے گی۔ لڑکی اس قدر جلی ہوئی تھی کہ اُس نے اشرف خان سے کہا۔ "اگر مجھ سے شادی نہ کرنا چاہو تو تمہاری داشتہ بننے کو بھی تیار ہوں۔"

وہ اشرف خان کی داشتہ تو پہلے ہی بنی ہوئی تھی۔ اشرف خان پر اُس کے حسن

اور اپنی مردانگی کا جادو سوار ہو گیا۔ اُس نے لڑکی سے کہا کہ اب وہ زمان پر انتقامی وار کر کے اُس سے ملے گا، ورنہ اُسے اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔ زمان کے ساتھ اُس کے مراسم تھے۔ وہ جواریوں کے خفیہ اڈے سے واقف تھا اور سکھ سے جواڑہ چلا رہا تھا، کمیشن وصول کرتا تھا۔ ایک روز اُسے پتہ چل گیا کہ آج رات جُوئے کی بازی لگے گی۔ وہ زمان سے یہ معلوم کرنے کے لیے ملا کہ وہ کھیلنے آئے گا یا نہیں۔ زمان آ رہا تھا۔

اشرف خان نے ایک حکیم نما پنساری سے تیزاب لیا اور اُسے اور زیادہ تیز کرنے کے لیے حکیم سے ایک اور چیز اس میں ملائی۔ میں تیزاب کا اور دوسری چیز کا نام نہیں لکھوں گا۔ اُس نے تیزاب کو گلاس میں ڈلوایا اور پنساری کی دکان پر ہی رہنے دیا۔ رات دکان بند ہونے کے وقت گلاس اُٹھا لے گیا۔ وہ بر وقت پہنچا۔ زمان جُوا کھیل کر جا رہا تھا۔ اشرف خان کو ان گلیوں سے واقفیت تھی۔ وہ دوسری طرف سے گلی کے موڑ پر جا کھڑا ہُوا۔ جونہی زمان موڑ پر آیا اشرف خان نے تیزاب اُس کے چہرے پر پھینک دیا۔ اگر زمان چیخیں نہ مارتا تو اشرف خان آہستہ آہستہ چلتا گلیوں میں غائب ہو جاتا مگر چیخوں نے اُسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اتنی تیز دوڑا کہ موڑ مڑتی ہوئی ریڑھی سے بچ نہ سکا۔

باقی کہانی آپ گواہوں کی زبانی سُن چکے ہیں۔ اشرف خان اور زمان کی بیوی کی ملاقات تیسری شام ہوئی۔ یہ لڑکی اس قدر خوش تھی کہ اشرف خان سے الگ ہو ہی نہیں رہی تھی۔ خوشی سے وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اشرف خان نے مجھے بتایا کہ لڑکی خوشی سے اتنی پاگل ہو چکی تھی کہ بار بار کہتی تھی ـــ "اشرف! تمہیں میرا گوشت

اچھا لگتا ہے نا! لو، کھا لو۔ میرے جسم کا جو حصہ اچھا لگتا ہے اسے کاٹو اور بھون کے کھا لو۔ مجھے کھا لو..... مجھے کھا لو اشرف۔"

مگر اشرف خان اُسے نہ کھا سکا۔ اُسے دِق کے جراثیم نے کھا لیا! اشرف خان کو سات سال سزائے قید ملی۔ زمان کی بیوی کو تین سال اور تیزاب تیار کر کے دینے والے حکیم کو ایک سال۔ زمان کی بیوی کو ڈیڑھ سال بعد رہائی مل گئی تھی۔ اُسے جیل میں ٹی بی ہو گئی تھی۔ رہا ہونے کے تین ماہ بعد ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر مری۔ زمان کو تو سب سے زیادہ سزا ملی تھی۔ تاحیات اندھا پن۔ میں نے اُس کا چہرہ اُس وقت بھی دیکھا تھا جب اُس کی پٹیاں اُتر چکی تھیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ چہرہ کس قدر بھیانک ہو گیا تھا۔ یہ سزا خدا نے دی تھی ——— حسن اور دولت کے غرور اور تکبر کی سزا!

گوہل کا تارا

عُمر کے اُس حصّے میں آ پہنچا ہوں جہاں کبھی تو کل کی بات بھُول جاتی ہے اور کبھی بچپن اور لڑکپن کے واقعات بھی اس طرح یاد آجاتے ہیں جیسے یہ کل کی باتیں ہوں۔ ایک روز لیٹے لیٹے اچانک اپنی جوانی کے زمانے کا ایک ہندو پولیس انسپکٹر جگموہن سنگھ یاد آگیا۔ وہ راجپوت تھا۔ غالباً بھرت پور کا رہنے والا تھا۔ ایک بار ناگ پور میں ایک ڈیوٹی کے سلسلے میں اُس سے ملاقات ہوئی۔ کچھ اور جگہوں کے بھی پولیس انسپکٹر آئے ہوئے تھے۔ جگموہن سنگھ کے متعلق پتہ چلا کہ جرأت مند، دیانت دار اور بڑا ہی ذہین پولیس آفیسر ہے۔ ہم سب چھ سات دن اکٹھے رہے۔ جگموہن سنگھ کو میں نے ہنسی مذاق کا دلدادہ پایا۔ لعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ انسپکٹری سے آگے ترقی نہیں پا سکا تھا کیونکہ وہ ایک بددیانت انگریز ایس۔ پی سے ٹکّر لے بیٹھا تھا۔

ایک رات ہم سب اکٹھے بیٹھے تو عجیب وغریب وارداتوں پر باتیں ہونے لگیں۔ پولیس کی نگاہ میں تو کوئی بھی واردات عجیب نہیں ہوتی کیونکہ انسان اور مجرمانہ ذہنیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسان کی فطرت کو ماہرینِ نفسیات سمجھتے ہیں یا

پولیس کے تجربہ کار افسر، پولیس کسی مشتبہ کا چہرہ اور حرکتیں دیکھ کر بتا سکتی ہے کہ اس شخص کا واردات سے تعلّق ہے یا نہیں۔ اصل کام یہ ہوتا ہے کہ اس سے اقبالِ جُرم کرایا جائے اور اس کے خلاف کیس ثابت کیا جائے۔ آج کل پولیس چہرہ شناسی اور انسان کی پہچان میں اتنی ماہر ہو گئی ہے کہ تھانے میں کوئی رپورٹ آجائے تو تھانے کا عملہ رپورٹ دینے والے کے چہرے کو اور جس کے خلاف وہ کیس کرنا چاہتا ہے، اُس کے چہرے کو دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ دونوں کتنے کتنے کی اسامیاں ہیں اور ان میں سے کون سی گائے زیادہ دُودھ دینے والی ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کسی پولیس انسپکٹر کے لیے کوئی واردات عجیب و غریب نہیں ہوتی پھر بھی بعض وارداتیں تجربہ کار تھانیداروں کو بھی چونکا دیتی ہیں۔ کچھ دن گزرے، مجھے جگموہن یاد آگیا اور یہ بھی یاد آیا کہ اُس نے ایک واردات سنائی تھی جو میں نے مختصر سی لکھ کر رکھ لی تھی۔ پُرانے کاغذات کی تلاشی لی تو اس واردات کے دو تین کاغذ مل گئے۔ مختصر سی تحریر کے اُدھورے اُدھورے فقروں سے میرے ذہن میں ساری کہانی اس طرح تازہ ہو گئی جیسے گزشتہ رات کی بات ہے کہ جگموہن سنگھ میرے پاس بیٹھا مجھے یہ کہانی سُنا رہا تھا اور میں اُس پر جرح کر رہا تھا کہ یہ کیسے ہُوا اور تم نے یہ کیا سوچ کر کیا، وغیرہ۔

یہ کہانی آپ کو اس لیے اچھی لگے گی کہ اس میں ایک شیر کے شکار کا قصّہ بھی ہے۔ میں آپ کو کہانی اپنے الفاظ میں سُناتا ہوں۔

قصّہ بہت پرانا ہے۔ آپ آج کل میلوں اور عُرسوں پر سرکس دیکھتے ہوں گے۔ یہ لوگ سرکس کے نام کی توہین کرتے ہیں۔ یہ نٹ اور معمولی سی قسم کے بازی گر

ہوتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں وہ سرکس تھے کہ بعض کرتب جادو کے کھیل لگتے تھے۔ رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان کے شیر اور چیتے جب پنجروں سے نکل کر کھلے پنجرے جیسے رِنگ میں آتے تھے تو اُن کی گرج اور اُن کی غصیلی چوکڑیوں سے پتہ چلتا تھا کہ یہ جنگل کا شاہی خاندان ہے اور ان پر کنٹرول کرنے والا جرأت اور عقل کا مالک ہے۔ کبھی کبھی ایسا واقعہ بھی سننے میں آتا تھا کہ کسی شیر یا چیتے نے ان سے کرتب کرانے والے کو چیر پھاڑ دیا۔

یہ سرکس سفری (ٹورنگ) ہوتے تھے۔ ہر سرکس کی اپنی بک کرائی ہوئی پوری ریل گاڑی ہوتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے ایک قصبے کی آبادی بمعہ چڑیا گھر سفر کر رہی ہو۔ ایسا سرکس بھارت کے ایک شہر نما قصبے کریم گنج میں آیا ہوا تھا۔ یہ شہر نیپال اور بھارت کی سرحد سے کوئی پینتیس میل دُور تھا۔ اس سرکس کے مالک کا نام راجن تھا۔ جگموہن سنگھ اُس وقت سب انسپکٹر تھا اور کریم گنج کے تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او تھا۔ راجن کے سرکس کو یہاں آئے ہوئے دس بارہ دن ہو گئے تھے۔

کیا شیر اور گھوڑا خود ہی چلے گئے؟

ایک رات شو ختم ہونے کے دو اڑھائی گھنٹے بعد سرکس کے اُن خیموں میں آگ لگ گئی جس میں سرکس کے کارندے وغیرہ رہتے تھے۔ وہ میدان تھا جو زیادہ وسیع نہیں تھا اس لیے خیمے ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ شو رات بارہ بجے کے لگ بھگ ختم ہوا تھا۔ آگ اُس وقت لگی جب سرکس والے تھکے ہوئے گہری

نیند سوئے ہوئے تھے ۔ وہاں پانی کی افراط تھی ۔ قریب ہی ایک قدرتی تالاب تھا۔ سرکس کے لوگ جاگے اور جو برتن ہاتھ آیا، لے کے اُٹھ دوڑے اور تالاب سے پانی لا لا کر جلتے ہوئے خیموں اور درندوں کے پنجروں پر پھینکنے لگے۔

شہر کے لوگ بھی شور شرابے سے جاگ اُٹھے اور سرکس والوں کی مدد کو پہنچ گئے۔ جگموہن سنگھ شہر کا ایک ذمّہ دار افسر تھا، وہ بھی آ گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ درندوں، گھوڑوں، ہاتھیوں اور بندروں نے جو شور و غل بپا کیا اس سے دل پر خوف طاری ہوتا تھا۔ ایک گھنٹے میں لوگوں نے آگ بُجھا دی۔ جگموہن سنگھ اپنے گھر چلا گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ سرکس والے پیٹرومیکس لیمپ اور لالٹینیں جلاتے ہیں، کسی کی بے احتیاطی سے کوئی لالٹین اُلٹ گئی ہو گی جس سے آگ لگی اور پھیل گئی۔ بہرحال جگموہن سنگھ اسے حادثاتی یا اتفاقی آگ سمجھا۔

صبح ہوئی تو سرکس کا رِنگ ماسٹر اور دو اور ذمّہ دار آدمی تھانے گئے اور جگموہن سنگھ کو رپورٹ دی کہ آگ لگی نہیں لگائی گئی تھی۔ انہوں نے سب سے بڑا نقصان یہ بتایا کہ سرکس کا مالک راجن زندہ جل گیا ہے اور اُس کی لاش جلے ہوئے خیمے میں زمین پر اوندھے منہ پڑی ہے۔ دوسرا نقصان یہ بتایا کہ پنجرے سے ایک شیر نکل گیا ہے اور پنجرے کا دروازہ بند ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نے پنجرہ کھولا اور جب شیر نکل گیا تو اس آدمی نے پنجرہ بند کر دیا۔

انہوں نے تیسرا نقصان یہ بتایا کہ ایک نہایت اعلیٰ گھوڑا بھی غائب ہے جو بڑے دلچسپ کرتب دکھایا کرتا تھا۔ انہوں نے گھوڑے کا حلیہ بھی بتایا۔ سرکس کے شیروں وغیرہ کے پنجرے دروازوں کے کواڑوں کی طرح نہیں کھلتے۔

ایک طرف سلاخوں کا دروازہ ہوتا ہے جو پنجرے کے اُوپر کھڑے ہو کر اُوپر کھینچ لیا جاتا ہے۔ شیر رنگ میں آجاتا ہے جو ایک گول اور کھلا پنجرہ ہوتا ہے۔

سرکس کے ان آدمیوں نے کہا کہ شیر خود تو پنجرے کا دروازہ اُوپر نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ وہ راجن کی موت اور شیر کی رہائی کو ایک جُرم کی دو کڑیاں بتا رہے تھے۔ جگموہن سنگھ نے اُن سے کہا کہ وہ بات بالکل صاف کریں کہ انہیں ایسا شک کیوں ہے۔ وہ کوئی ٹھوس شک بیان نہ کر سکے۔

"آٹھ نو خیمے جل گئے ہیں"۔۔۔ رنگ ماسٹر نے جو اینگلو انڈین تھا، کہا۔۔۔ "اِن میں سرکس کے کارندے سوئے ہوئے تھے۔ وہ جلتے ہوئے خیموں میں سے نکل گئے تھے۔ راجن کیوں نہیں نکل سکا؟"۔۔۔ یہ اینگلو انڈین خاصا ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے کہا۔۔۔ "وہ اپنی چارپائی سے نیچے پڑا تھا۔ کیا وہ فوراً ہی اتنا بے بس یا بے ہوش ہو گیا تھا کہ وہ خیمے سے نکل نہ سکا اور وہیں اوندھے مُنہ گر پڑا؟"

"اُسے شراب نے بے بس اور بے ہوش کر رکھا ہوگا"۔۔۔ جگموہن نے کہا۔۔۔ "میں جانتا ہوں آپ لوگ پانی کی طرح شراب پیتے ہیں۔"

"راجن مجھ سے زیادہ نہیں پیتا"۔۔۔ سرکس کے ایک اور آدمی نے کہا۔۔۔ "یہ صحیح ہے کہ شراب کا نشہ انسان کو بے حال کر دیتا ہے لیکن جان کا خطرہ آپڑے تو نشہ فوراً اُتر جاتا ہے۔"

"ہم رپورٹ لے کر آئے ہیں"۔۔۔ رنگ ماسٹر نے کہا۔۔۔ "اور ہم آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ آپ چل کر تفتیش کریں گے۔ ایک بڑا اہم آدمی قتل ہو گیا ہے۔ ہمارا ایک شیر اور ایک بڑا ہی قیمتی گھوڑا غائب ہے۔"

"کیا آپ کو یہ شک ہے کہ شیر اور گھوڑا چوری ہوئے ہیں؟" — جگموہن نے پوچھا۔

"شک نہیں یقین" — رنگ ماسٹر نے جواب دیا — "گھوڑوں تک آگ نہیں پہنچی تھی۔ گھوڑے بدکتے اور ہنہناتے رہے تھے۔ ان کے پچھلے پاؤں مضبوط رسّوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان سے کوئی گھوڑا آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں، ہم آپ کو دکھائیں گے کہ ہر گھوڑے کی پچھلی ٹانگوں میں ٹخنوں کے قریب چمڑے کے کالر چڑھائے جاتے ہیں۔ یہ کالر کُتّے کے پٹّے کی طرح بکل سے بند کیے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ مضبوط رسّہ ہوتا ہے یا زنجیر جو مضبوط کیل کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ اس گھوڑے کے پاؤں کے دونوں پٹّے کھُلے ہوئے تھے۔ انہیں صرف انسانی ہاتھ کھول سکتے تھے۔"

جگموہن سنگھ کو کیس رجسٹر کرنا پڑا لیکن صرف گھوڑے اور ایک شیر کی چوری کا۔ قتل کا کیس وہ لاش دیکھ کر اور یقین کر کے کہ یہ واقعی قتل کی واردات ہے، رجسٹر کرنا چاہتا تھا۔ سرکس کے یہ آدمی ٹلنے والے نہیں تھے۔ جگموہن انہیں ٹالنا چاہتا تھا۔ وہ اُن کے ساتھ چلا گیا۔

کیا اسے باندھ کر زندہ جلایا گیا؟

جلے ہوئے خیمے میں سے راجن کی لاش اُٹھائی نہیں گئی تھی۔ جگموہن سنگھ کو راجن کے خیمے تک لے گئے۔ رات ہوا کچھ تیز چلی تھی۔ خیمہ جلا اور اس کی راکھ نیچے گرنے

کی بجائے اُڑتی رہی۔ راجن کی لاش زمین پر پیٹ کے بل پڑی تھی۔ جگموہن سنگھ نے لاش کو غور سے دیکھا تو ایک خاص چیز نظر آئی۔ آپ اس محاورے سے واقف ہوں گے کہ جل گئی پر بل نہ گیا۔ یہ محاورہ رسّی کے متعلق ہے۔ رسّی جل کر راکھ ہو جاتی ہے مگر راکھ کی شکل میں اس کے بل بدستور موجود رہتے ہیں۔ راجن نے جلی ہوئی دو رسّیاں دیکھیں۔ ایک کی راکھ لاش کے ٹخنوں کے ساتھ زمین پر تھی اور دوسری لاش کی پیٹھ پر۔ لاش کے دونوں بازو پیٹھ پر تھے۔ کلائیاں ملی ہوئی تھیں۔

جگموہن سنگھ نے رنگ ماسٹر سے کہا۔ "یہ قتل کی واردات ہے۔ مقتول کے ہاتھ اور پاؤں رسّیوں سے باندھ دیئے گئے تھے۔ ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھے گئے تھے اور یہ چارپائی سے گرا نہیں بلکہ آگ لگنے سے پہلے زمین پر پڑا ہوا تھا۔" سفری (فولڈنگ) چارپائی جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ وہاں ایک سٹول تھا۔ دو کرسیاں اور ایک تپائی تھی اور ایک چھوٹی سی میز۔ سب کچھ راکھ ہو گیا تھا۔

میں آپ کو ایک خاص بات بتاتا ہوں۔ جلی ہوئی رسّی کی راکھ اتنی نمایاں نہیں تھی کہ ہر کوئی دیکھ کر کہہ سکتا کہ یہ جلی ہوئی رسّی ہے۔ یہ جگموہن کی عقل تھی کہ اس نے اسے جلی ہوئی رسّی کہا تھا۔ رنگ ماسٹر نے ٹھیک کہا تھا کہ راجن بھاگ سکتا تھا۔ جگموہن نے بھی سوچا کہ راجن کے کپڑوں کو اگر آگ لگ گئی تھی اور وہ بیدار ہونے تک خاصا جل چکا تھا تو بھی وہ چند قدم تو بھاگ ہی سکتا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے تھے۔

جگموہن خیمے کی دوسری اشیاء کو دیکھنے لگا۔ میز کی راکھ پر ایک لیمپ پڑا تھا جو مٹی کے تیل سے جلتا تھا۔ اس کی چمنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ جگموہن سنگھ نے رنگ ماسٹر سے

پوچھا کہ کیا یہ لیمپ راجن کے خیمے میں جلا کرتا تھا؟ رنگ ماسٹر نے بتایا کہ یہ راجن کا لیمپ ہے۔ جگموہن سنگھ نے دیکھا کہ اس لیمپ کا اُس جگہ سے ڈھکنا غائب تھا جہاں تیل ڈالا جاتا تھا۔ اُس نے سب سے کہا کہ خیمے کے ارد گرد دیکھیں۔ لیمپ کا ڈھکنا کہیں پڑا مل جائے گا۔ ڈھکنا چوڑی دار ہونا چاہیے تھا۔

جگموہن کا دماغ گہرائی میں چلا گیا تھا۔ اُسے یہ شک ہوا تھا کہ راجن کو رسیوں سے باندھ کر زمین پر پھینکا گیا اور لیمپ کا ڈھکنا اُتار کر لیمپ کا تیل اِدھر اُدھر چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ تیل راجن پر بھی چھڑکا گیا ہوگا۔ جل کر لاش کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ پہنے ہوئے کپڑوں کا نشان تک نہ تھا۔ یہاں میں پھر جگموہن سنگھ کی عقل کی تعریف کروں گا کہ اُس نے لیمپ کا ڈھکنا اُترا ہوا دیکھ کر یہ سراغ حاصل کیا کہ اس لیمپ کا تیل خیمہ جلانے کے کام آیا ہے۔ آپ ذرا اس خیمے کو تصور میں لائیں جس میں بہت سا سامان جل کر راکھ ہوگیا اور خیمہ بھی جل گیا تھا۔ وہاں ایک لیمپ پر کس کی نظر جا سکتی تھی جو آگ کی تپش سے سیاہ ہوگیا تھا اور جس کا شیشہ یعنی چمنی ٹوٹ گئی تھی۔

لیمپ کا ڈھکنا تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ اتنی راکھ میں چھوٹا سا ڈھکنا کہاں مل سکتا تھا۔ یہ جگموہن کی خوش قسمتی تھی کہ لوگوں نے دوسرے خیموں پر پانی پھینکا تھا۔ راجن کا خیمہ پانی سے بچا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ لوگوں کے بیدار ہونے تک راجن کا خیمہ جل چکا تھا۔ یہ خیمہ دوسروں سے ذرا الگ تھلگ تھا۔ تیز ہوا اس کے جلتے ہوئے چیتھڑے اُڑا کر دوسرے خیموں تک لے گئی یا یوں بھی ہوا ہوگا کہ آگ لگانے والے نے کسی دوسرے خیمے کو بھی آگ لگا دی ہوگی جو باقی خیموں کے ساتھ تھا۔

سرکس کی لڑکیاں

جگموہن سنگھ نے لاش کی برآمدگی اور اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے کاغذات تیار کیے۔ گواہوں کے دستخط لیے اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ عام قسم کا پوسٹ مارٹم اس شہر میں ہو سکتا تھا۔ جگموہن سنگھ نے رنگ ماسٹر اور سرکس کے دوسرے ذمہ دار آدمیوں سے کہا کہ ان کا سرکس سفری ہے لیکن اب انہیں تفتیش مکمل ہونے تک یہیں رہنا پڑے گا۔ اینگلو انڈین رنگ ماسٹر بہت تیز آدمی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ راجن کو وہ اپنا سگا بھائی سمجھتا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ پورا ایک سال سرکس کو یہیں پر رکھے گا۔ قاتل ملنا چاہیے۔

جگموہن سنگھ نے پنجرہ دیکھا جس میں سے شیر نکل گیا تھا، پھر وہ جگہ دیکھی جہاں سے گھوڑا کھولا گیا تھا۔ پٹے کا بکل ٹوٹا ہوا نہیں کھلا ہوا تھا۔ اُسے گھوڑا نہیں کھول سکتا تھا۔ جگموہن سنگھ نے سرکس کے کارندوں پر نظر دوڑائی جو اِدھر اُدھر کام کاج میں مصروف تھے یا پولیس کو دیکھ رہے تھے۔ اُسے سات آٹھ نوجوان لڑکیاں دکھائی دیں جو جسموں کی ساخت کے لحاظ سے تو دلکش تھیں ہی، نقش و نگار کے لحاظ سے وہ بہت ہی حسین تھیں۔ یہ سرکس کی لڑکیاں تھیں جو مختلف کرتب دکھاتی تھیں۔ جگموہن سنگھ کو پہلا خیال یہ آیا کہ وہ ان میں سے کسی بھی لڑکی کی خاطر دو چار آدمیوں کو قتل کر سکتا ہے اور اُسے حاصل کرنے کے لیے پورے سرکس کو آگ لگا سکتا ہے۔ لڑکیوں کے حسن اور جسمانی ساخت میں انگیخت تھی اور یہ بزدل آدمی کو بھی مشتعل کر کے اُس سے کسی

کو بھی قتل کرا سکتی تھیں۔

جگموہن سنگھ رِنگ ماسٹر اور ایک اور آدمی کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔ یہ آدمی اُسے رِنگ ماسٹر کی طرح ذہین نظر آیا تھا۔ جگموہن سنگھ نے تھانے لے جا کر انہیں بتایا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ حادثہ نہیں، بہت بڑے جُرم کی واردات ہے اور اب اُس کی ضرورت یہ ہے کہ رِنگ ماسٹر اور دوسرا آدمی (جسے ہم کہانی سُنانے کی خاطر مدن کہہ لیتے ہیں) جگموہن سنگھ کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں اور اُس سے کچھ بھی نہ چھپائیں اور کوئی بات جو اُن کے لیے خواہ بالکل معمولی ہو اُسے بتائیں۔

جگموہن سنگھ نے سب سے پہلے سرکس کی لڑکیوں کے متعلق شک کا اظہار کیا کہ ان میں سے کوئی لڑکی اس بھیانک واردات کا باعث بنی ہوگی۔ یہ رقابت ہوگی۔ راجن چونکہ سرکس کا مالک تھا، اس لیے اُس نے کسی ایسی لڑکی کو اپنی داشتہ بنا رکھا ہوگا جو کسی اور کو چاہتی ہوگی۔ اُس آدمی نے راجن کو قتل کر دیا اور سرکس کو بھی تباہ کرنے کی کوشش کی۔

"اس صورت میں اُس لڑکی کا اور اس آدمی کا غائب ہو جانا ضروری تھا"۔۔۔ مدن نے کہا۔۔۔ "کوئی ایک بھی لڑکی غیر حاضر نہیں اور سرکس کے تمام آدمی موجود ہیں۔"

"آپ سرکس کی دُنیا سے واقف نہیں"۔۔۔ رِنگ ماسٹر نے کہا۔۔۔ "سرکس کی لڑکیوں کی ٹریننگ بچپن سے شروع کی جاتی ہے۔ ان کے کرتب آپ نے دیکھے ہیں تار پر چلنا، ایک پینگ سے دوسری پینگ پر اُلٹ بازی لگا کر جانا، زمین پر کرتب دکھاتے ہوئے جسم کو ربڑ کی طرح دوہرا کرنا وغیرہ، آپ نے دیکھا ہے۔ آپ نے ضرور سوچا ہوگا کہ ان لڑکیوں کے جسموں میں ہڈیاں نہیں، یہ تو ربڑ کی بنی ہوئی ہیں۔ ان کے جسموں کو ہم واقعی

ربڑ کی مانند کر دیتے ہیں۔ اتنی لچک تیس سال سے بھی زیادہ عمر تک قائم اور برقرار رکھنے کے لیے ہم ان پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہیں ہم بدکاری کی طرف نہیں جانے دیتے۔ کسی بھی سرکس کا مالک کرتب دکھانے والی کسی لڑکی کے ساتھ بے ہُودہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا نہ ان میں سے کسی کو داشتہ بنانے کی سوچ سکتا ہے۔ یہ لڑکیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔"

"آپ عصمت فروشوں سے واقف ہوں گے"۔ مدن نے کہا۔ "کوئی قحبہ اور کوئی بھی گانے والی آپ کو اپنے ناچ گانے سے خوش کرے گی مگر اپنا جسم نہیں بیچے گی کیونکہ اُسے اپنے جسم کی لچک اور آواز کے سوز کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ اسی لیے ناچنے والیاں بڑھاپے تک ناچنے کے قابل رہتی ہیں اور گانے والیاں ضعیفی میں بھی اچھی طرح گا سکتی ہیں۔ اسی طرح ہم سرکس کی لڑکیوں کو جوانی ڈھل جانے تک کرتب دکھانے کے قابل رکھتے ہیں۔"

"راجن شراب پیتا تھا"۔ رِنگ ماسٹر نے کہا۔ "ہر طرح کی عیّاشی کرتا تھا لیکن اپنے سرکس کے اندر نہیں۔ جب سرکس کسی بڑے شہر میں جاتا تھا تو راجن باہر سے عیاشی کا سامان لے آتا تھا۔"

جگموہن کو پھر بھی اطمینان نہ ہُوا۔ اُس نے بہت جرح کی۔ وہ کہتا تھا کہ سرکس میں کیا مرد کیا لڑکیاں، سب انسان ہیں اور انسان اپنی فطرت کے مطالبوں کو دبا نہیں سکتا۔ اس جرح میں رِنگ ماسٹر اور مدن نے ایک لڑکی کا نام بتایا جو راجن کو پسند تھی اور وہ کبھی کبھی راجن کے خیمے میں جایا کرتی تھی لیکن انہوں نے کہا کہ راجن اُسے بُری نیت سے نہیں بلکہ اُس کے کمالات کی وجہ سے پسند کرتا تھا۔ جگموہن کی جرح میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ یہ لڑکی ایک آدمی کو بہت پسند کرتی تھی۔ وہ رسّے پر کرتب دکھایا

کرتا تھا۔ وہ بہت خوبرو اور بڑے ہی دل نشین جسم کا آدمی تھا۔ راجن کو ان کی ملاقاتوں کی رپورٹ ملی تو اُس نے دونوں کو تنبیہہ کی تھی اور سمجھایا بھی تھا کہ اُن کے جسم ہی اُن کی روزی کا ذریعہ ہیں۔ جسم جتنی جلدی بیکار ہوں گے وہ اتنی جلدی بے روزگار ہوں گے۔ رِنگ ماسٹر اور مدن نے بتایا کہ اُن کا کوئی سکینڈل نہیں سُنا گیا مگر جگموہن سنگھ کی تسلّی نہ ہوئی۔ اُس نے اس لڑکی اور اس آدمی کو تھانے بُلا لیا۔

وہ عورت کون تھی؟

لڑکی کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ جگموہن نے پہلے اُسے اپنے پاس بٹھایا اور اُس سے پوچھا کہ وہ راجن کو اور راجن اُسے کس حد تک پسند کرتا تھا۔ جگموہن نے اس لڑکی کی آنکھیں اور ناک دیکھی تو صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت روئی ہے۔ اب جگموہن نے اُس کے سامنے راجن کا نام لیا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"وہ میرا باپ تھا"۔ اُس نے کہا۔ "سرکس کی تمام لڑکیاں اُسے اپنا باپ سمجھتی تھیں۔"

"کیا وہ اتنا زیادہ شریف آدمی تھا؟"۔ جگموہن سنگھ نے پوچھا۔

"صرف ہمارے ساتھ شریف تھا"۔ لڑکی نے جواب دیا۔ "ویسے وہ بالکل شریف آدمی نہیں تھا۔ سرکس جب کسی بڑے شہر میں جاتا تھا تو رات کو شہر سے نئی سے نئی عورت راجن کے خیمے میں آتی تھی۔"

"لیکن رسّے پر کرتب دکھانے والا وہ آدمی تو راجن کو اپنا باپ نہیں سمجھتا

ہوگا جو تمہیں چاہتا ہے"۔ جگموہن نے پوچھا "راجن اُسے تم سے ملنے سے روکا کرتا تھا... کیا یہ آدمی راجن کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا تھا؟"

"نہیں"۔ لڑکی نے کہا "ان کے درمیان کوئی دشمنی تو نہیں تھی۔ راجن نے ملنے سے نہیں روکا تھا۔ وہ احتیاط کرنے کو کہتا تھا۔"

جگموہن نے اس لڑکی کے ساتھ بہت دماغ سوزی کی اور اپنا تجربہ اور ذہانت استعمال کر کے دیکھ لیا، اُسے لڑکی اور اُس کا چاہنے والا صاف نظر آئے۔ لڑکی چالاک اور ہوشیار نہیں لگتی تھی۔ وہ چالاک ہو بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ بچپن میں وہ سرکس میں آئی اور سرکس میں ہی جوان ہو گئی تھی۔ ان لڑکیوں کو باہر کے لوگوں سے میل ملاقات کی اجازت نہیں تھی۔ وہ سرکس کی قیدی تھیں۔ جگموہن سنگھ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بھولی بھالی لڑکی تھی۔

جگموہن اتنی جلدی مطمئن ہونے والا آدمی نہیں تھا۔ اُس نے پوچھ گچھ اور جرح جاری رکھی۔ اس دوران لڑکی نے یہ انکشاف کیا کہ چند مہینے گذرے، جب سرکس کسی اور شہر میں تھا، ایک آدمی نے اس لڑکی سے کہا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ چلے اور وہ اُسے اس سے دُگنی تنخواہ دلائے گا جو اُسے اس سرکس سے ملتی تھی۔ وہ ایک اور بہت بڑے سرکس کا آدمی تھا۔ سرکسوں والے عموماً ایک دوسرے کے اچھے فنکاروں کو لالچ دینے اور اپنے سرکس میں لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

لڑکی نے یہ پیشکش قبول نہ کی اور راجن کو بتا دیا کہ فلاں سرکس کا آدمی اُسے اپنے سرکس میں چلنے کو کہتا ہے۔ راجن نے اس سرکس کے مالک کو بڑا سخت اور توہین آمیز پیغام بھیجا تھا۔ اس لڑکی کو راجن کے اسی ردِ عمل کا پتہ چلا تھا۔ بعد میں جگموہن نے

رِنگ ماسٹر اور مدن سے پوچھا کہ انہیں اس سلسلے میں کچھ معلوم ہے؟ رِنگ ماسٹر نے بتایا کہ اُس کے ساتھ راجن نے ذکر کیا تھا۔ دوسرے سرکس کے مالک نے راجن کو اُس کے پیغام کے جواب میں دھمکی بھیجی تھی کہ اگر راجن نے پھر کبھی اُسے ایسا پیغام بھیجا تو وہ اپنے پُورے سرکس سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

"کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے۔۔۔ اس سرکس کے مالک نے راجن کے سرکس کو نقصان پہنچانے کے لیے یہ واردات کرائی ہو؟" جگموہن نے پوچھا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" رِنگ ماسٹر نے کہا۔ "وہ سرکس آج کل کلکتہ میں ہے۔"

"میں وہاں جا کر تحقیقات کر سکتا ہوں" جگموہن نے کہا "لیکن مخبری اور جاسوسی اگر آپ لوگ کریں تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔ آپ اپنے دو تین ایسے کارندے کلکتہ بھیجیں جنہیں اُس سرکس میں کوئی نہ پہچان سکے اور وہ اپنے گھوڑے اور شیر کو پہچان سکیں۔"

جگموہن نے انہیں یہ بات کہہ تو دی لیکن اُسے خیال آیا کہ اگر گھوڑا اُس سرکس کے کسی آدمی نے چوری کیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر کلکتہ تک پہنچنا کچھ مشکل نہیں۔ شیر کو کس طرح کلکتہ لے جایا گیا ہوگا؟ شیر کُتا تو نہیں تھا کہ گلے میں رسّی ڈال کر ساتھ لے گئے یا اُٹھا کر لے گئے۔ شیر کو پنجرے سمیت لے جایا جا سکتا تھا لیکن پنجرہ ریلوے کی مال گاڑی سے ہی لے جایا جا سکتا تھا۔ پنجرہ بہیں پڑا تھا۔ اُس زمانے میں پرائیویٹ ٹرک نہیں چلتے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ ملزموں نے شیر کا پنجرہ کھول کر شیر کو بھگا دیا اور گھوڑا لے گئے۔ بہرحال رِنگ ماسٹر نے کہا کہ وہ دو آدمی کلکتہ بھیج دے گا۔

یہ تو بعد کی بات ہے۔ جگموہن سنگھ لڑکی سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ گھوم پھر کر بات پھر راجن کے کردار پر آ گئی۔ جگموہن اب اس شک پر آ گیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ راجن نے اس قصبے کی کسی عورت کو پھانسنے اور اپنے خیمے میں بُلانے کی کوشش کی ہو یا کسی لڑکی کو سرکس میں شامل کرنے کا لالچ دیا ہو۔ اس عورت یا لڑکی کے لواحقین کو پتہ چل گیا ہو اور انہوں نے یہ انتقامی کارروائی کی ہو۔

"جب سے تمہارا سرکس یہاں آیا ہے"۔ جگموہن نے لڑکی سے پوچھا۔ "اس شہر کی کوئی عورت راجن کے خیمے میں کبھی آئی ہے؟"

"میں نے چار پانچ روز گذرے، ایک عورت کو دن کے وقت اُس کے خیمے میں سے نکلتے دیکھا تھا"۔ لڑکی نے جواب دیا۔

"اگر وہ عورت تمہارے سامنے آئے تو اُسے پہچان سکتی ہو؟"

"نہیں"۔ لڑکی نے جواب دیا۔ "میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی.... اُس نے قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے لیکن میں اُس کی عمر نہیں بتا سکتی کیونکہ چہرہ نہیں دیکھا تھا۔"

گومل اور شیر کی دوستی

راجن کے اخلاق کی باتیں ہو رہی تھیں۔ لڑکی سے پتہ چلا کہ راجن نے شادی کی ہی نہیں تھی۔ لڑکی پہلے بتا چکی تھی کہ راجن شریف آدمی نہیں تھا۔ اب پھر بات ہوئی تو لڑکی نے بتایا کہ راجن کاروبار اور لین دین کے معاملے میں دیانتدار نہیں تھا۔

سرکس کے کارندوں کو وقت پر تنخواہ دے دیتا تھا لیکن جن دکانداروں یا ٹھیکیداروں سے جانوروں کے لیے چارہ، درندوں کے لیے گوشت اور انسانوں کے لیے راشن پانی آتا تھا انہیں وہ پیچھے پھرا پھرا کر پیسے دیتا اور اکثر اُن کی کچھ رقم مار لیتا تھا۔ لین دین کے سلسلے میں وہ کسی نہ کسی کے ساتھ لڑتا جھگڑتا ہی رہتا تھا۔

"یہ شیر جو نکل گیا ہے، یہ ہمارے پاس اُس وقت آیا تھا جب اس کی عمر تین ساڑھے تین مہینے تھی"۔۔۔ لڑکی نے بتایا ۔۔۔"راجن نے ابھی تک اس کی قیمت ادا نہیں کی۔ شیر کی عمر دو سال ہو گئی ہے۔ جو آدمی اس بچے کو لایا تھا وہ چار پانچ روز پہلے بھی آیا تھا۔ وہ جب بھی آتا تھا، راجن اُسے شراب پلا کر کچھ دیر اپنے ساتھ رکھتا پھر اُسے چلتا کر دیتا تھا"۔

"اس کے ساتھ بھی راجن کا لڑائی جھگڑا رہتا ہو گا؟"۔۔۔ جگموہن نے پوچھا۔

"اس آدمی کے ساتھ راجن کے عجیب سے تعلّقات تھے"۔۔۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔"کبھی شک ہوتا تھا جیسے ان کی گہری دوستی ہے۔ کبھی میں نے انہیں ایک دوسرے کو دھمکیاں دیتے بھی دیکھا... میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی کیونکہ میں ان کی ہر ملاقات کے وقت ان کے ساتھ نہیں ہوتی تھی"۔

جگموہن نے اُس سے پوچھا کہ وہ رنگ ماسٹر اور مدن کے سامنے بھی راجن کی اس بددیانتی اور کاروبار میں بداخلاقی کی باتیں کرے گی؟ لڑکی نے کہا کہ وہ اُن کے سامنے یہ باتیں کرنے سے نہیں ڈرے گی۔ جگموہن نے رنگ ماسٹر اور مدن کو اندر بُلا لیا اور انہیں بتایا کہ یہ لڑکی راجن کے متعلق یہ باتیں بتا رہی ہے۔

"راجن میں یہ بہت بڑی خرابی تھی"۔۔۔ رنگ ماسٹر نے کہا ۔۔۔"وہ دوسروں

کی رقمیں دبالیتا تھا۔ اس لڑکی نے آپ کو ٹھیک بتایا ہے۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ کوئی بظاہر بے معنی اور معمولی سی بات آپ کے ذہن میں آئے تو وہ بھی مجھے بتائیں"۔ جگموہن نے کہا۔ "آپ نے اتنی اہم بات مجھے نہیں بتائی۔ اس لڑکی کی باتوں سے میرے ذہن میں آتا جا رہا ہے کہ قتل کا باعث کیا ہو سکتا ہے۔ قتل کا ایک باعث یہ ہو سکتا ہے کہ اس شہر کی کوئی عورت اس کے پاس آتی تھی یا اُس نے اس عورت کو کوئی جھانسہ دے کر اپنے خیمے میں بُلایا تھا۔ اس عورت کے لواحقین نے راجن سے انتقام لیا ہے۔ دوسرا باعث یہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے کسی ایسے بیوپاری یا ٹھیکیدار کے بِل کی ادائیگی روک لی ہو گی جس کا تعلّق غنڈوں اور بدمعاشوں کے ساتھ ہے۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ کریم گنج کے بدمعاش سارے صوبے میں مشہور ہیں۔"

"یہ سراغ رسانی تو آپ کو کرنی ہے"۔ مدن نے کہا۔

"میں تو کروں گا ہی"۔ جگموہن نے کہا۔ "آپ یوں کریں کہ مجھے اُن ٹھیکیداروں اور دکانداروں کے نام پتے دیں جو سرکس کو گوشت اور دیگر مال سپلائی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بتائیں کہ وہ آدمی کون ہے جس نے سرکس کو یہ شیر دیا تھا جو پنجرے سے نکل گیا ہے۔"

رِنگ ماسٹر اور مدن نے اُس آدمی کا نام گومل بتایا اور اُس کے متعلق یہ بتایا کہ وہ اُن جنگلوں میں رہتا ہے جو نیپال کی سرحد سے بھی آگے چلے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ سرکس کچھ عرصے سے اسی صوبے میں گھوم رہا تھا، اس لیے یہ آدمی راجن سے ملتا رہتا تھا۔ اُس نے سرکس کو لنگوروں اور بندروں کے بچّے سپلائی کیے تھے۔ ایک ریچھ کا بچّہ بھی

سپلائی کیا تھا اور آخر میں وہ شیر لایا تھا۔ اُس وقت یہ شیر بچّہ تھا۔ گومل نے اُسے تین چار مہینے اپنے پاس رکھا تھا۔ اس سے یہ ہُوا کہ بچّہ اُس سے مانوس ہو گیا۔ گومل بچّے کو یہاں لایا تو گومل کے سوا کسی اور کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ یہ رِنگ ماسٹر درندوں کو سدھانا جانتا تھا لیکن اس بچّے کے ساتھ اُسے کچھ مشکل پیش آئی۔ وہ اسے سدھا سکتا تھا لیکن راجن نے گومل سے کہا کہ وہ سرکس کے ساتھ رہے اور اس بچّے کو سدھائے۔

گومل نے وہیں رہنا شروع کر دیا۔ رِنگ ماسٹر کی ہدایات کے متعلق گومل بچّے کو سدھاتا رہا اور بچّہ ڈیڑھ پونے دو سال کا ہو کر پورا شیر بن گیا۔ یہ ببر شیر نہیں تھا، دھاری دار تھا جسے ٹائیگر کہتے ہیں۔ اسے پنجرے میں رکھا جاتا تھا کیونکہ یہ جوان شیر تھا۔ صرف گومل تھا جسے دیکھ کر یہ شیر پالتو کتّے کی طرح دُم ہلاتا اور گومل کے ہاتھ چاٹتا تھا۔ کوئی دوسرا قریب جاتا تو شیر غصّے میں آجاتا تھا۔ رِنگ میں آکر رِنگ ماسٹر کو پریشان نہیں کرتا تھا۔

گومل کا کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ چلا گیا۔ رِنگ ماسٹر اور مدن کو معلوم نہیں تھا کہ راجن نے اس شیر کی کتنی قیمت اور اسے سدھانے کے لیے گومل کی کتنی اُجرت طے کی تھی۔ اُنہیں صرف یہ معلوم تھا راجن نے گومل کو قیمت ادا نہیں کی تھی۔ اُجرت بھی شاید کم ہی دی تھی۔ البتہ راجن نے گومل کو اپنا دوست بنا لیا تھا اور اُسے شراب پلاتا تھا۔ اُس کا اور گومل کا آپس میں لڑائی جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔ دو تین بار رِنگ ماسٹر نے گومل سے کہا کہ وہ راجن کے ساتھ بدتمیزی نہ کیا کرے۔ گومل نے اُسے بتایا کہ راجن اُسے شیر کی قیمت ادا نہیں کر رہا۔

رِنگ ماسٹر نے راجن سے کہا کہ وہ اس جنگلی کو پیسے دے دے اور اسے چلتا کرے۔ راجن نے کہا کہ شیر کی قیمت جتنی تو یہ اُس سے شراب پی چکا ہے۔ مختصر یہ کہ اُن کی آپس میں چپقلش چل رہی تھی۔ آگ لگنے سے تین چار روز پہلے بھی گومل آیا تھا۔ وہ اپنے سدھائے ہوئے شیر کے پنجرے کے سامنے جا کھڑا ہُوا تو شیر اُسے دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ گومل نے ہاتھ پنجرے کے اندر کیا تو شیر اُس کے ہاتھ کو چاٹنے لگا۔ گومل نے یہ خطرناک حرکت کی کہ پنجرے کا دروازہ اُوپر اُٹھا دیا۔ شیر باہر آگیا اور گومل کے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ دیکھنے والے اِدھر اُدھر بھاگ گئے لیکن شیر نے گومل کے سوا کسی اور طرف توجہ ہی نہ دی۔ گومل نے اشارہ کیا تو شیر اُچھل کر پنجرے میں چلا گیا۔ گومل نے دروازہ جو دراصل سلاخیں تھیں، نیچے کر دیا۔

"یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ شیر انسان کے ساتھ اتنا پیار کرتا ہے"۔ رِنگ ماسٹر نے کہا ۔"شیر کُتّے کی طرح پیار کرنا جانتا ہے۔ گومل نے تو اسے اپنے ہاتھ سے دُودھ پلایا تھا اور شیر اسی کے ہاتھ سے کھا کھا کر جوان ہُوا تھا۔ میں درندوں کی فطرت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ جنگل میں بھی وہی شیر خطرناک ہوتا ہے جو بھوکا ہو یا جس کے منہ انسانی خون اور گوشت لگ گیا ہو یا شیر اُس کے لیے خطرناک ہوتا ہے جس سے اُسے ڈر ہو ورنہ شیر حملہ نہیں کرتا۔"

گومل کے متعلق رِنگ ماسٹر اور مدن نے بتایا کہ وہ ہے تو جنگلی لیکن معمولی قسم کا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ اُس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ بتائی گئی۔ شکل و صورت بہت اچھی اور اُس کا جسم پھُرتیلا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دلیر اور پُراسرار آدمی ہے۔

ٹھیکیدار بھی آ گئے، غنڈے بھی

جگموہن سنگھ نے گوپال کے متعلق بہت کچھ پوچھا جو اُسے بتایا گیا لیکن یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔ صرف یہ معلوم تھا کہ وہ فلاں جنگلوں میں رہتا ہے۔ اتنے وسیع جنگل میں اُس کی تلاش آسان نہیں تھی۔ تاہم اُسے تلاش کرنا تھا جس کے لیے وقت درکار تھا۔ پولیس کے لیے کسی کی تلاش ناممکن نہیں ہوتی۔ وقت بہت چاہیئے۔

دن گذر گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آ چکی تھی۔ اس کے مطابق موت جلنے سے واقع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے یہ بھی لکھا تھا کہ مقتول کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ کپڑا جو منہ سے باہر تھا وہ جل گیا تھا۔ اس سے مقتول کے ہونٹ جل کر سُوج گئے اور آپس میں مل گئے تھے۔ اندر کا کپڑا نہیں جلا تھا۔ جگموہن یہ کپڑا پہلے نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ لاش کے ہونٹ بند اور بُری طرح سُوجے ہوئے تھے۔ جگموہن سنگھ نے اپنے علاقے کے ڈی۔ ایس۔ پی کو واردات کی رپورٹ اور اُس وقت تک جو کارروائی کی تھی، بھیج دی تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی انگریز تھا۔

جگموہن نے رنگ ماسٹر، مدن اور لڑکی کو بھیج دیا اور اُس آدمی کو اپنے ساتھ رکھا جو اس لڑکی کو چاہتا تھا۔ اُس سے جگموہن نے رات بہت دیر تک پُوچھ گچھ جاری رکھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس شخص کے دل میں لڑکی کی محبت ضرور ہے لیکن راجن کی دشمنی نہیں۔

دوسرے دن رنگ ماسٹر نے تھانے جاکر جگموہن کو دو آدمیوں کے نام بتائے۔ یہ دونوں سرکس کو جانوروں اور کھانے پینے کا سامان سپلائی کرتے تھے۔ جگموہن نے دونوں کو بلالیا اور اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ مخبروں سے کہو کہ یہ معلوم کریں کہ ان ٹھیکیداروں کے تعلّقات غنڈوں اور بدمعاشوں سے ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو وہ کون ہیں۔

ٹھیکیدار آگئے۔ جگموہن نے دونوں سے الگ الگ پُوچھ گچھ کی۔ معلوم ہُوا کہ دونوں کی خاصی رقم راجن نے ادا نہیں کی۔ دونوں کا راجن کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہُوا تھا۔ دونوں نے راجن سے کہا تھا کہ وہ بل ادا کردے ورنہ وہ سپلائی روک لیں گے۔ راجن نے اُنہیں کہا تھا کہ روک لو، میں بل ادا کیے بغیر سرکس کو اگلے شہر لے جاؤں گا۔ انہوں نے سپلائی نہ روکی۔ راجن نے دونوں کو تھوڑے تھوڑے پیسے دے دیے۔

ان دونوں کو جگموہن نے تفتیش میں بہت رگڑا۔ تین چار گھنٹے گذر گئے تھے۔ ان میں سے ایک کے متعلق ایک مخبر نے آکر اطلاع دی کہ اس کا دوستانہ دو غنڈوں کے ساتھ ہے۔ ان دو میں سے ایک دو بار کا سزا یافتہ تھا۔ جگموہن نے ان دونوں کو بھی بُلالیا۔ پھر دونوں ٹھیکیداروں سے الگ الگ اور دونوں غنڈوں سے الگ الگ پُوچھ گچھ شروع ہو گئی۔

اس قسم کے مشتبہ افراد سے تفتیش کسی اور انداز سے کی جاتی ہے۔ غنڈوں پر جگموہن نے تھرڈ ڈگری طریقہ (اذیّت رسانی) بھی استعمال کیا تھا لیکن کسی نے بھی اقبالِ جرم نہ کیا۔ جگموہن سنگھ نے انہیں چھوڑا نہیں۔ تھانے میں ہی بٹھائے رکھا۔

اُس روز ڈی۔ ایس۔ پی بھی آگیا۔ واردات سنگین تھی۔ انگریز اپنے قانون

کی اور امنِ عامہ کی توہین برداشت نہیں کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تھانیدار دن رات ایک کیے رکھتے تھے اور جو تھانیدار "چائے پانی" کے عادی تھے اُنہیں تو اور زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی کیونکہ "چائے پانی" پر پردہ ڈالنا خاصا مشکل کام ہوتا تھا۔ جگموہن کے ڈی۔ ایس۔ پی نے جائے واردات دیکھی پھر جگموہن کی کارروائی دیکھی اور اُس سے پوچھا کہ وہ کس لائن پر تفتیش کر رہا ہے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے دونوں ٹھیکیداروں سے کہا کہ جب تک وہ پولیس کو یقین نہیں دلا دیتے کہ وہ بے گناہ ہیں انہیں تھانے سے باہر نہیں جانے دیا جائے گا۔ اس سے جگموہن سنگھ کا حوصلہ اور زیادہ بڑھ گیا۔

جگموہن نے ڈی۔ ایس۔ پی کو گومل کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ ڈی ایس پی نے اُسے کہا کہ وہ ان جنگلوں کے علاقے کے تمام تھانوں کو اطلاع بھجوا دے جس میں گومل اور گھوڑے کے حلیے لکھے جائیں۔ بشیر کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کہاں گیا۔

تھانوں کو یہ اطلاع ڈی۔ ایس۔ پی نے خود بھجوا دی۔

ڈی۔ ایس۔ پی کے جانے کے بعد جگموہن نے تفتیش جاری رکھی۔ اُدھر رنگا ماسٹر اور مدن نے سرکس کو رواں کر لیا۔ انہیں تنخواہیں دینے کے لیے سرکس کو چلانا تھا۔

نمبردار کا پیٹ چاک ہو گیا

وقت گذرتا گیا اور تین مہینے گذر گئے۔ سرکس وہیں رہا حالانکہ اس کی آمدنی خاصی

کم ہو گئی تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی خود بھی تفتیش میں دلچسپی لیتا رہا لیکن بات وہیں رہی جہاں پہلے دن تھی۔ رِنگ ماسٹر کبھی جگموہن سنگھ کے سر پر جا سوار ہوتا کبھی ڈی۔ ایس۔ پی کے ہاں چلا جاتا۔ اگر وہ خاموش رہتا تو جگموہن ڈی۔ ایس۔ پی کی اجازت لے کر کیس، عدم پتہ قرار دے کر فائل کر دیتا۔

جگموہن کی طرف سے کیس عدم پتہ ہی تھا۔ اس کا وجود صرف فائل میں رہ گیا تھا یا اسے رِنگ ماسٹر اور مدن نے زندہ رکھا ہوا تھا۔ انہیں راجن کی موت کا اتنا غم نہیں تھا بلکہ وہ خوش نظر آتے تھے۔ راجن کا کوئی وارث نہیں تھا جو اُس کی جگہ سرکس کا مالک بنتا۔ اب رِنگ ماسٹر اور مدن اس کے مالک تھے۔ وہ مجرم کو اس لیے پکڑنے پر زور دے رہے تھے کہ انہیں ڈر تھا کہ مجرم اگر سرکس کا کوئی کارندہ ہے تو نہ پکڑے جانے کی صورت میں وہ ایسی ہی واردات دوبارہ کرے گا اور سرکس تباہ ہو جائے گا۔

ایک روز جگموہن سنگھ کو ڈی۔ ایس۔ پی کا فون ملا۔ اُس نے کہا ''معلوم ہوتا ہے تمہارا ملزم مل گیا ہے۔ جلدی آؤ۔''

جگموہن اُسی وقت روانہ ہو گیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی پچیس میل دُور بڑے شہر میں تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اُسے یہ کہہ کر ریسٹ ہاؤس میں بھیج دیا کہ وہاں اُسے ایک انگریز میجر پیٹر ہال ملے گا اور وہ اس میجر کی ساری کہانی سُن کر تیس پینتیس میل دُور جانے کی تیاری کر لے۔

جگموہن ریسٹ ہاؤس میں چلا گیا جہاں میجر پیٹر موجود تھا۔ انگریز افسر بڑی صاف اُردو بولا کرتے تھے۔

''میں نے اسے ایک دلچسپ کہانی سمجھ کر تمہارے ڈی۔ ایس۔ پی کو سنائی

تھی"۔ میجر پیٹر نے جگو بن سنگھ سے کہا "لیکن وہ خوشی سے چونک پڑا اور کہنے لگا کہ یہ شخص جس نے اپنا نام گومل بتایا ہے ہمیں مطلوب ہے۔ میں نوتانوا کے جنگل میں شکار کھیلنے گیا تھا۔ وہاں شیر (ٹائیگر) مل جاتے ہیں۔ وہاں میں ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا۔ مجھے اس جنگل کے ایک باشندے کا انتظار تھا جس کا نام مجھے گومل بتایا گیا تھا اور مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ وہ نہ صرف ماہر شکاری ہے بلکہ شیر کو گھیر کر سامنے لانے کا ماہر ہے اور وہ جنگل کا بھیدی ہے۔ وہ درندوں کے بُجھے ہوئے نقوشِ پا بھی پہچان کرتا دیا کرتا ہے کہ درندہ کس طرف گیا ہے....

"مجھے وہاں کے نمبردار نے بتایا کہ گومل اگلے روز پہنچ جائے گا۔ میں دن کے پچھلے پہر سیر کے لیے باہر نکل گیا۔ وہاں قدرتی پودے اور درخت بہت زیادہ تھے۔ اس سے چار پانچ فرلانگ دُور نوتانوا گاؤں ہے جہاں زیادہ تر لوگ کسان ہیں یا جنگل میں مزدوری کرتے ہیں۔ میں اس گاؤں سے دُور ایک اور طرف چلتا گیا۔ کوئی ایک میل دُور گیا ہوں گا کہ آگے ایک برساتی نالہ نظر آنے لگا جس کے کنارے اونچے تھے اور نالہ خشک تھا کہیں کہیں تھوڑا سا پانی تھا....

"مجھے اپنی دائیں طرف جھاڑیوں میں سرسراہٹ سُنائی دی۔ شکاری جنگل کی ایسی سرسراہٹ کو نظرانداز نہیں کیا کرتے۔ میں نے رُک کر اُدھر دیکھا تو میری رگوں میں خون رُک گیا اور میں بُت کی طرح ساکت ہو گیا۔ مجھ سے دس بارہ قدم دُور ایک شیر کھڑا مجھے گھور رہا تھا اور وہ اپنی ٹانگیں نہایت آہستہ آہستہ اس طرح دوہری کر رہا تھا جس طرح شیر اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ میرے ہاتھ میں رائفل نہیں تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ شیر یہاں سے دُور رہتے ہیں مگر یہ شیر گاؤں

اور ریسٹ ہاؤس کے قریب پھر رہا تھا....

"مجھے زندگی میں پہلی بار پتہ چلا کہ موت کا ذائقہ کیا ہوتا ہے۔ میں ایسی موت نہیں مرنا چاہتا تھا کہ شیر مجھ زندہ کو چیر پھاڑ دے مگر یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ خدا کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ شیر نے اس طرح ایک طرف دیکھا اور ٹانگیں سیدھی کر کے جمائی لی جیسے اُسے میرے ساتھ کوئی دلچسپی نہ ہو۔ وہ منہ پھیر کر آہستہ آہستہ چلا گیا۔ میری جان میں جان آئی۔ وہ جنگل میں غائب ہو گیا اور دُور برساتی نالے میں نظر آیا پھر وہاں سے بھی غائب ہو گیا۔ میں واپس ریسٹ ہاؤس میں آ گیا....

"رات کے وقت مجھے گاؤں کی طرف سے مویشیوں کا شور و غل سُنائی دیا۔ ان کی آوازوں سے پتہ چلتا تھا کہ ان پر کوئی خطرہ آن پڑا ہے۔ ذرا ہی دیر بعد اس خطرے کی آواز بھی سُنائی دی۔ یہ شیر کی آواز تھی جسے شکاری پہچانتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ شیر نے مویشیوں پر حملہ کر دیا ہے۔ میں ان کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ صبح ہوئی تو گاؤں کے بہت سے آدمی میرے پاس آئے۔ وہ ہراساں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ رات کو بہت سے مویشی ایک جگہ اکٹھے رکھے جاتے ہیں۔ ان کے اردگرد جھاڑیوں کی باڑ ہے۔ رات کو ایک شیر باڑ کے اندر آ گیا۔ مویشی ڈر کر چیخنے اور بھاگنے لگے۔ نمبردار دوڑا گیا۔ گاؤں کے لوگ شیر کی آواز سُن کر دبکے رہے۔ جب خاموشی ہوئی تو لوگوں نے جا کر دیکھا۔ نمبردار خون میں ڈوبا پڑا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ شیر نے اُس کے ایک پہلو سے پیٹ پھاڑ ڈالا تھا۔ صبح لوگوں نے مویشیوں کو اکٹھا کیا تو پتہ چلا کہ ایک بچھڑا گم ہے۔ زمین پر نشان دیکھے۔ شیر اسے گھسیٹ کر لے گیا تھا....

"میں گاؤں میں چلا گیا۔ نمبردار کی لاش اُس کے گھر پڑی تھی۔ اُسے دیکھا شیر

نے اُس کے صرف پہلو میں پنجہ مار کر اُس کا پیٹ چاک کر دیا تھا۔ جسم پر اور کوئی زخم نہیں تھا۔ میں نے باہر جا کر زمین دیکھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ بچھڑے کو شیر گھسیٹ کر کدھر لے گیا ہے۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی۔ میں اس نشان پر چلتا گیا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ شیر انسان کا گوشت کھانے کا عادی نہیں ورنہ وہ منیر کی لاش اُٹھا لے جاتا۔ اُسے ایک جانور کی ضرورت تھی۔ اُسے بچھڑا پسند آیا اور اُسے مار کر لے گیا۔ شیر وہ خطرناک ہوتا ہے جو انسان کے گوشت کا عادی ہو جاتا ہے....

"گاؤں کے لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ اس گاؤں کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ شیر گاؤں میں آیا ہے، ورنہ یہاں دُور دُور تک شیر نظر نہیں آتا... میں آگے چلتا گیا۔ برساتی نالے میں سے بھی گذر گیا۔ پار چلا گیا اور بیس پچیس گز دُور مجھے مرا ہوا بچھڑا پڑا نظر آ گیا۔ میں ذرا قریب جا کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ بچھڑا صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس کی صرف ایک ٹانگ کھائی ہوئی تھی۔ شیر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ تین چار گیدڑ آ گئے اور گدھ بھی آ گئے تھے۔ میں خاصی دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ شیر کا نام و نشان نہ تھا۔۔

یہ شخص مجسّم راز تھا

"میں اس ارادے سے واپس آ گیا کہ رات کو اسی درخت پر واپس آؤں گا۔ شیر عموماً رات کو اپنے مارے ہوئے شکار پر آیا کرتا ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں آیا تو برآمدے میں ایک دراز قد، بڑے مضبوط جسم اور اچھی شکل و صورت کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس دونالی بندوق تھی۔ میرا اردلی اُس کے پاس کھڑا

تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ یہ آدمی وہ شکاری ہے جسے میری راہنمائی اور ساتھ کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس آدمی نے اپنا نام گومل بتایا۔ میں نے شکار کے دوران ایسے بہت سے آدمی دیکھے ہیں۔ وہ مرے مرے اور جُھکے جُھکے سے ہوتے ہیں اور انگریز شکاریوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بہت غریب ہیں تاکہ انگریز افسر رحم کر کے زیادہ انعام دے جائیں، لیکن گومل کے چہرے کے تاثرات میں اور اُس کی آنکھوں کی چمک میں خود اعتمادی اور وقار سا تھا۔ اُس نے مجھے اس طرح سلام کیا جیسے وہ میرے ہی عہدے کا افسر ہو۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے پہلا ہندوستانی مددگار دیکھا ہے جو اپنے آپ کو غلام اور غریب ظاہر نہیں کر رہا....

"میری نظر اُس کے گھوڑے پر پڑی جو پرے بندھا ہوا تھا۔ گھوڑا اتنی اچھی نسل کا تھا کہ مجھے یقین نہ آیا کہ جنگل کا یہ باسی اس گھوڑے پر آیا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا، گومل یہ گھوڑا کہاں سے لائے ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ یہ ڈیڑھ دو سال سے اُس کے پاس ہے۔ ان لوگوں کے پاس گھوڑے کہاں! ان میں سے کوئی عیاشی کرے تو ٹٹو قسم کی مریل سی گھوڑی رکھ لیا کرتا تھا۔ میں کچھ دیر گھوڑے کو دیکھتا رہا۔"

جگموہن سنگھ نے میجر پیٹرہال سے گھوڑے کا حلیہ پوچھا۔ اُس نے حلیہ بتایا تو جگموہن نے اُچھل کر کہا ـــ "وہی ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایسا اعلیٰ گھوڑا کسی جنگلی کے پاس نہیں ہو سکتا۔ وہ سرکس کا گھوڑا ہے" ـــ جگموہن کو گھوڑے کا حلیہ زبانی یاد تھا۔ یہ گھوڑا عام گھوڑوں سے ویسے بھی بہت مختلف تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا اور اس پر ہلکے اور کچھ گہرے بادامی رنگ کے چھوٹے چھوٹے داغ دھبّے تھے۔

"میں گومل کو وہیں سے اپنے ساتھ گاؤں میں لے گیا"۔ میجر پیڑہال نے جگموہن کو سنایا۔ "اور اُسے کہا کہ وہ اس شیر کے پنجوں کے نشان پہچان لے۔ نشان برساتی نالے کی ریت اور مٹی پر زیادہ صاف تھے۔ گومل نے یہ نشان دیکھے تو وہ ایک نشان کے پاس بیٹھ گیا۔ میں اُس پر جھک گیا۔ اُس کے منہ سے بڑی دھیمی آواز میں یہ الفاظ نکلے۔ 'یہاں آ گیا ہے؟' میں نے اُس سے پوچھا 'تم اس شیر کو جانتے ہو؟' ۔۔۔ وہ چونک پڑا جیسے اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ میں اُس کے ساتھ ہوں۔ اُس نے عجیب سی ہنسی ہنس کر کہا۔ 'ہاں صاحب بہادر! میں اس شیر کو پہچانتا ہوں لیکن یہ کسی انسان پر حملہ نہیں کرے گا'۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اس شیر کو کس طرح جانتا ہے؟ اُس نے اُدھورے اُدھورے سے دو تین الفاظ منہ سے نکالے پھر جیسے اُس کے ذہن میں معقول جواب آ گیا ہو۔ کہنے لگا۔ 'ہم لوگ جنگل کے بھیدی ہیں۔ کسی ایک شیر یا چیتے کے پاؤں کا نشان دیکھ لیں تو وہ ذہن میں بیٹھ جاتا ہے'۔۔۔۔

"مجھے اطمینان ہو گیا کہ بڑا ذہین گائیڈ اور مددگار شکاری مل گیا ہے لیکن شیر کے پنجے کے نشان دیکھ کر اُس کے چہرے پر میں نے جو تبدیلی دیکھی تھی وہ بلاوجہ اور بے معنی نہیں تھی۔ ہم ریسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ میرے اردلی نے میری عادت کے مطابق وہسکی کی بوتل اور گلاس میرے آگے رکھ دیا۔ میں نے ویسے ہی گومل کی طرف دیکھا۔ وہ وہسکی کی بوتل کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک اور گلاس منگوا کر اُسے وہسکی ڈال دی۔ یہ آدمی مجھے اچھا لگا تھا اور مجھے شک ہو گیا تھا کہ یہ شخص خود ایک مجسّم راز ہے یا کوئی اور خاص بات ہے

جیسے یہ مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے ۔ بہرحال یہ آدمی میرے لیے دلچسپ تھا۔"

انگریزوں کی ذہانت کی متعلق میں آپ کو ایک بات بتا دوں ۔ اس قوم نے آدھی دنیا پر بادشاہی کی ہے ۔ یہ انگریزوں کے اوصاف کا کرشمہ تھا ۔ انگریز ڈسپلن، کام اور دیانت داری کو اپنا مذہب سمجھتے تھے ۔ ان میں انسان شناسی کا وصف خاص طور پر تھا ۔ جس ملک پر حکومت کرتے تھے ۔ وہاں کے لوگوں کی نفسیات، معاشرت اور مذہب سے گہرائی تک واقفیت حاصل کر لیتے تھے ۔ انسان کا چہرہ پڑھ کر اُس کے ساتھ ناپ تول کر بات کرتے تھے میں یہاں تک کہوں گا کہ ہمارے متعلق جو انگریز کو معلوم تھا وہ ہم خود بھی نہیں جانتے تھے ۔

اس میجر نے گومل کو دیکھا تو وہ اس جنگلی میں دلچسپی لینے لگا ۔

وہ شیر کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا

میجر پیٹر ہال نے جگموہن کو یہ دلچسپ کہانی سُناتے ہوئے کہا "میں نے گومل سے کہا کہ اس شیر کو مارنا ضروری ہو گیا ہے کیونکہ اس نے مویشیوں پر حملہ کیا تو اسے ایک بچھڑا مل گیا ۔ یہ اس کے لیے آسان شکار تھا ۔ وہ اب مویشیوں پر ہی حملے کرتا رہے گا، اور یہ خطرہ بھی ہے کہ مویشیوں کے ساتھ انسان بھی ہوتے ہیں، شیر کہیں انسان کے گوشت کو نہ چکھ لے ۔ گومل نے کہا "آپ شیر کے شکار کے لیے آئے ہیں ۔ میں آپ کو آگے لے جاؤں گا جہاں آپ شیر کا شکار کھیل سکتے ہیں ۔ میں آپ کو ایک تفریح کرانا چاہتا ہوں...... ہم شیر کو زندہ پکڑیں گے ۔

میں پنجرہ بناؤں گا جو دراصل پھندہ ہو گا۔"...
"میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے ساتھ مجھے بھی مروائے گا اور وہ ایسا مذاق نہ کرے۔ گومل نے اُسے بتایا کہ وہ شکار کا اتنا ماہر نہیں جتنی اُسے درندوں اور جانوروں کو پھندوں میں پھانسنے کی مہارت ہے، اور یہ کھیل بڑا ہی دلچسپ ہے۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بعض مہاراجے اور نواب شیر دل، ہرنوں، بارہ سنگوں وغیرہ کے بچے پالنے کے لئے خریدتے ہیں۔ وہ کئی بچّے بیچ چکا ہے اور ایک سرکس کو بھی اُس نے شیر کا ایک بچّہ، لنگور اور بندر سپلائی کیے تھے۔ حکومت کے افسروں نے اُسے ایک بار ایک جوان شیر پکڑنے کو کہا تھا جو اُس نے پھندے میں پھانس دیا تھا۔ یہ شاید کسی چڑیا گھر کے لیے تھا...
"میں نے تفریح اور تماشے کے لیے اُسے کہہ دیا کہ اس شیر کو پھانس لے۔ اُس نے اُسی وقت جا کر گاؤں سے کچھ آدمی ساتھ لیے اور اگلے دن دوپہر تک ایک بہت بڑا بانسوں کا پنجرہ تیار کر لیا۔ اس میں کیل نہیں لگائے گئے تھے۔ بانسوں کو سَن یا بان کی قسم کی لمبی گھاس سے باندھا گیا تھا۔ گومل کہتا تھا کہ یہ گھاس بہت تیز چھُرے سے ہی کٹ سکتی ہے۔ وہ پنجرہ اُٹھوا کر اور مجھے ساتھ لے کر جنگل میں دو میل اندر چلا گیا۔ بکری کا ایک بچّہ بھی اُس نے ساتھ لے لیا تھا۔ اُس نے پنجرہ ایک جگہ رکھوایا اور بکری کے بچّے کو اُس کے اندر ایک کونے میں باندھ دیا۔ ایک رسّی بانس کی ایک کیل سے باندھی اور سامنے والا دروازہ اُوپر اٹھا دیا۔ دروازہ اُوپر ہی اٹک گیا۔ اسے بانس کے کیل نے روک لیا تھا۔ گومل ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل پنجرے میں گیا۔ جونہی وہ پنجرے میں داخل ہُوا، رسّی نے بانس کے

کیل کو کھینچ لیا اور دروازہ گر پڑا۔ پنجرہ بند ہو گیا....

"میں نے دروازہ اُٹھایا۔ گومل ہنستا ہُوا باہر آیا۔ اُس نے دروازے کے نیچے کیل لگا دیا اور بکری کے بچّے کو اندر ہی بندھا چھوڑ کر ہم واپس آ گئے۔ گومل نے کہا کہ شیر جب بکری کے بچّے کو مار چکے گا تو اُسے پتہ چلے گا کہ وہ بند ہو گیا ہے پھر وہ بڑی زور سے گرجے گا۔ ہم ریسٹ ہاؤس کو آنے کی بجائے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہے۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے پنجرہ دیکھنے گئے۔ شیر کی آمد رات کو متوقع تھی لیکن ہم نے پنجرے کا دروازہ بند دیکھا۔ پنجرے میں بکری کا بچّہ تھا، شیر نہیں تھا۔ گومل نے سب سے پہلے زمین دیکھی۔ شیر آیا تھا۔ پنجوں کے نشان صاف تھے۔ گومل نے دروازہ اُوپر اٹھایا تو اُسے وہاں شیر کے کچھ بال دکھائی دیے جو اُس نے مجھے بھی دکھائے۔ شیر آیا تھا لیکن پنجرے کے دروازے میں اُس نے قدم رکھا تو اُوپر سے دروازہ گر پڑا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کا پاؤں یا منہ کا کوئی حصّہ دروازے کے نیچے آیا جو شیر نے باہر کھینچ لیا اور اُس کے کچھ بال دروازے کے نیچے رہ گئے....

"گومل نے کہا کہ دروازہ اچھی طرح نہیں اٹکا تھا اس لیے وہ دوسری کوشش کرے گا لیکن میں نے روک دیا اور کہا کہ میں کوئی اور کھیل تماشا نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں شیر کے شکار کے لیے آیا ہوں اور میں اسی شیر کو ماروں گا۔ میں نے دیکھا کہ گومل کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ شیر کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ وہ اس شیر کو زندہ پکڑ کر کسی سرکس یا کسی چڑیا گھر کے حوالے کرکے پیسہ کمائے گا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنا کاروبار میرے جانے کے بعد چلا سکتا

ہے، پہلے میرے شکار میں میری مدد کرے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اُس میں ایک انگریز افسر کی حکم عدولی کی جرأت نہیں تھی۔"

گومل کے آنسو نکل آئے

جس طرح آج مجھے اس کہانی کی ایک ایک تفصیل یاد آ گئی ہے، اسی طرح مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جگموہن سنگھ نے مجھے یہ کہانی سناتے ہوئے کہا تھا — "انگریز افسر مختصر اور صرف کام کی بات کیا کرتے ہیں لیکن اس انگریز میجر نے ہندوستانی عورتوں کی طرح بات اتنی لمبی کر دی کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھی۔ میں نے اُسے کہا، مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا ملزم یہی گومل ہے۔ گھوڑا جو اُس کے پاس ہے وہ راجن کے سرکس کا ہے اور اب مجھے شک ہونے لگا ہے کہ اس شیر کو گومل مارنا نہیں چاہتا تھا بلکہ زندہ پکڑنا چاہتا تھا کیونکہ یہ وہی شیر تھا جو اُس نے خیموں کو آگ لگا کر سرکس کے پنجرے سے نکال دیا ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ شیر اُس کے ساتھ کتے کی طرح پیار کرتا تھا۔"

جگموہن نے مجھے سُنایا کہ انگریز میجر ایک ہندوستانی سب انسپکٹر کی یہ "بدتمیزی" برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے حاکموں کے لہجے میں کہا — "میری پوری بات غور سے سنو۔ تمہارے ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہیں پوری بات سُناؤں۔ معلوم ہوتا ہے تم میری بات سے اُکتا گئے ہو اور اپنی ڈیوٹی میں کوتاہی کر رہے ہو۔ تمہیں شاید احساس نہیں کہ کتنا بڑا جرم سرزد ہوا ہے۔

تم ہندوستانیوں کی دل چسپی صرف تنخواہ کے ساتھ ہوتی ہے۔"

جگموہن سنگھ ایسی ڈانٹ برداشت کرنے والا نہیں تھا۔ اُس نے میجر کو کھری کھری سُنا دیں اور اُسے کہا۔ "آپ بات پوری سُنائیں یا نہ سُنائیں، میں اپنے ملزم کو اس جنگل میں شیروں کی کچھار میں سے بھی نکال کر لے آؤں گا۔"

پھر بھی جگموہن کو ساری کہانی سننی پڑی جو اُس کے لیے دلچسپ تو بہت تھی لیکن وہ وقت بچانا چاہتا تھا اور اُس کا ارادہ یہ تھا کہ فوراً نوتانوا کو روانہ ہو جائے اور پیشتر اس کے کہ گومل کہیں روپوش ہو جائے، اُسے گرفتار کر لے۔

کہانی چونکہ دلچسپ تھی اس لیے مجھے بھی آج تک یاد ہے۔ میجر پیٹر ہال نے جگموہن کو سُنایا:

"رات کو پھر وہی شور سُنائی دیا۔ مویشی خوفزدہ ہو کر چلّا رہے تھے مگر شیر کی آواز نہ آئی۔ صبح گاؤں کے چند ایک آدمی ریسٹ ہاؤس میں آئے۔ وہ بہت ڈرے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ شیر کے پہلے حملے سے ڈر کر انہوں نے مویشیوں کے باڑے پر گذشتہ رات ایک آدمی کا پہرہ کھڑا کر دیا تھا۔ رات کو شیر آیا اور اس آدمی کو مار کر چلا گیا۔ میں نے گومل سے کہا کہ اس شیر کو فوراً مار دینا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ کہہ کر میں اُسے گاؤں میں لے گیا۔ لاش دیکھی۔ وہ ایک جوان آدمی تھا۔ شیر نے اُس کا سَر منہ میں لے کر کچل ڈالا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ شیر انسان خور نہیں ہے اور اسے انسان کے گوشت کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں، ورنہ وہ لاش اپنے ساتھ لے جاتا۔ میرا یہ خطرہ صحیح ثابت ہُوا کہ شیر مویشیوں کو آسان شکار سمجھ کر اسی باڑے میں آیا کرے گا۔۔۔۔

"میں گومل کو ساتھ لے کر ریسٹ ہاؤس گیا۔ کھانے پینے کا سامان تھیلوں میں ڈال کر ہم شیر کے تعاقب میں چل پڑے۔ گومل شیر کے پنجوں کے نشان دیکھنے کا ماہر تھا۔ وہ مجھے صحیح سمت لے جا رہا تھا۔ نشان مجھے بھی نظر آ رہے تھے۔ ہم بہت دور نکل گئے۔ آگے پہاڑی آ گئی۔ ہم اس پر جا رہے تھے کہ شیر تقریباً ایک سو گز دور جاتا نظر آیا۔ اس کا ایک پہلو ہماری طرف تھا۔ وہ جس طرف جا رہا تھا وہاں چند قدم آگے گھنی جھاڑی تھی۔ مجھے اپنے نشانے پر بھروسہ تھا۔ میں نے ایک خطرہ مول لیا۔ رائفل کندھے سے لگائی اور گولی چلا دی۔ شیر پوری طرح گرا نہیں۔ اس کے جسم کا پچھلا حصہ زمین سے لگا اور شیر دوڑ کر جھاڑی میں غائب ہو گیا....

"گومل نے کہا "صاحب بہادر! اب یہ شیر اور زیادہ خطرناک ہو گیا ہے کیونکہ زخمی ہو گیا ہے۔ یہی وہ خطرہ ہے جو میں نے مول لیا تھا۔ زخمی شیر بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ زخمی شیر کا تعاقب کر کے اسے مارنا ہی پڑتا ہے۔ اگر اسے زندہ چھوڑ دیا جائے تو وہ جس انسان کو دیکھتا ہے اس پر حملہ کرتا ہے اور بڑا ہولناک انتقام لیتا ہے۔ میں اور گومل وہاں گئے جہاں شیر کو میری گولی لگی تھی۔ ہم اب بہت محتاط تھے۔ شیر کا حملہ کسی بھی لمحے متوقع تھا۔ وہاں خون تھا، شیر نہیں تھا۔ آگے گھنی جھاڑی تھی۔ ہم نے اس میں پتھر پھینکے اور کان کھڑے کر کے شیر کی آواز سننے کی کوشش کی ہمیں کوئی آواز نہ سنائی دی....

"گومل جھاڑ میں سے نہ گزرا۔ اس نے مجھے بھی جھاڑ میں جانے سے روک دیا۔ ہم باہر باہر سے دوسری طرف گئے۔ ہمیں خون اور پنجوں کے نشان نظر آ گئے۔ گومل نے کہا کہ شیر کی پچھلی اور بائیں ٹانگ میں گولی لگی ہے لیکن ہڈی نہیں ٹوٹی

ورنہ شیر اتنی جلدی غائب نہ ہو جاتا۔ خون زیادہ تھا۔ گولی پٹھے میں سے گذری تھی۔ خون کو دیکھتے ہم بڑھتے چلے گئے لیکن اب ہم بے فکری سے نہیں چل رہے تھے....

"آگے دریا آ گیا جس میں پانی کم تھا۔ گومل نے مجھے کہا کہ میں کنارے کے ساتھ آگے بڑھوں اور وہ دوسری طرف سے جائے گا تاکہ شیر کو آگے سے روکا جا سکے۔ میں گومل سے جُدا ہو گیا۔ تقریباً ایک میل گئے ہوں گے کہ مجھے ایک سو گز سے زیادہ فاصلے پر شیر نظر آ گیا۔ پہلے کی طرح اب بھی اُس کے آگے جھاڑ تھی۔ اُسے معلوم نہیں کیسے شک ہو گیا کہ کوئی خطرہ ہے۔ وہ لنگڑاتا ہُوا تیزی سے چلنے لگا اور جھاڑ میں داخل ہو گیا۔ ابھی اُس کا آدھا جسم باہر تھا کہ میں نے رائفل کندھے سے لگا کر اُس پر گولی چلا دی۔ شیر گرا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ یہ گولی بھی مہلک ثابت نہیں ہوئی تھی۔ ایک اور گولی چلی جو گومل نے چلائی تھی۔ میں دوڑا گیا۔ شیر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ مرتے وقت کی آوازیں تھیں....

"میں جب شیر کے قریب پہنچا تو وہ آخری سانسیں لے رہا تھا اور گومل اس سے کچھ دُور کھڑا اُسے بالکل ویسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اپنے کسی عزیز کو مرتے دیکھتا ہے۔ اُس کے چہرے پر اُداسی تھی۔ شاید اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ شیر مر گیا تو گومل اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اُسے شیر کے مرنے کا افسوس ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ تم اسے زندہ پکڑ کر کسی چڑیا گھر یا کسی سرکس کو دینا چاہتے تھے۔ تمہارا بہت نقصان ہُوا ہے۔ اُس نے آہستہ سے گردن گھمائی اور مجھے دیکھا لیکن بولا کچھ بھی نہیں....

"میں کل یہاں آیا ہوں۔ شیر کی کھال سر سمیت ساتھ لے آیا ہوں۔ تمہارا

ڈی۔ایس۔پی میرا گہرا دوست ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک دن گذارنے کے لیے رُک گیا۔ رات کو میں نے اُسے شکار کی یہ داستان سُنائی تو وہ چونک پڑا اور اُس نے کہا کہ تم نے غالباً ہماری تفتیش مکمل کر دی ہے۔ اُس نے اُسی وقت تمہیں ٹیلیفون کر کے بلا لیا۔ تم نے میری روئیداد بڑے غور سے سُنی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں بہت سے کھوج اور سراغ دے دیے ہیں۔ ڈی۔ایس۔پی نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ نوتانوا جاؤں۔ تمہیں میری راہنمائی کی ضرورت ہوگی۔"

بندوق کی نالی میجر کی طرف کر دی

ڈی۔ایس۔پی کی ہدایات کے مطابق میجر پیٹر ہال اور جگموہن سنگھ یہ سکیم بنا کر گومل کی گرفتاری کے لیے روانہ ہوئے کہ نوتانوا کے ریسٹ ہاؤس میں رات کے وقت پہنچیں گے تاکہ وہاں کسی کو پتہ نہ چلے کہ میجر پیٹر ہال کے ساتھ پولیس بھی آئی ہے۔ کھانے پینے کے انتظام کے لیے میجر پیٹر ہال کا اردلی اور پولیس ہیڈکوارٹر کے انتظام کے تحت ایک باورچی پہلے ہی روانہ کر دیے گئے۔ جگموہن کے ساتھ چار پانچ کانسٹیبل تھے۔

یہ پارٹی سکیم کے مطابق رات کو وہاں پہنچی۔ جگموہن اور کانسٹیبلوں کو چھپ کے رہنا تھا۔ رات کو ہی میجر نے گاؤں کے سرکاری آدمی کو بُلایا اور اُسے کہا کہ وہ گومل کو ڈھونڈ کر اُسے کل دن کو یہاں پہنچنے کو کہہ آئے۔ میجر نے پیغام کے ساتھ یہ بھی کہلا بھیجا کہ ایک انگریز کرنل کو شیر کی کھال چاہیے اس لیے میں راستے سے واپس

آ گیا ہوں۔

گومل قریب ہی کہیں مل گیا اور دوسرے دن ریسٹ ہاؤس میں آگیا۔ وہ اُسی گھوڑے پر آیا تھا۔ میجر پیٹرہال نے اُسے جس کمرے میں بٹھایا، اس کے ساتھ والے کمرے میں جگموہن اور کانسٹیبل موجود تھے۔ جگموہن نے دروازے کا کواڑ ذرا سا کھول رکھا تھا تاکہ میجر اور گومل کی باتیں سن سکے۔ میجر نے گومل کو وہسکی پلائی اور اُسے کہا کہ ایک کرنل انگلینڈ جا رہا ہے۔ وہ شیر کی کھال اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ وہ اس شیر کی کھال لینا چاہتا تھا جو ہم دونوں نے مارا ہے لیکن میں یہ کھال نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا کہ جاؤ اور ایک اور شیر مار لاؤ۔ وہ میرا دوست ہے۔ میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ میں واپس آگیا ہوں۔

میجر پیٹرہال فوج کا افسر تھا، پولیس کا نہیں تھا۔ اُس نے یہ احمقانہ حرکت کی کہ گومل سے ایسے سوال کرنے شروع کر دیے کہ اُسے شک ہو گیا۔ پہلے اُس سے پوچھا کہ یہ گھوڑا کہاں سے لیا تھا۔ گومل نے گول مول سا جواب دیا تو میجر نے کہا کہ یہ کسی سرکس کا گھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اُس نے گومل سے پوچھا— ”مجھے یقین ہے کہ جو شیر ہم نے مارا ہے اس کے ساتھ تمہارا کوئی گہرا تعلق تھا۔ تم نے پہلے روز اس کے پنجوں کے نشان پہچان کر کہا تھا کہ یہ یہاں آگیا ہے۔ کیا بات ہے، گومل؟“

گومل نے اُسے گول مول جواب دیا۔ جگموہن سامنے نہیں آسکتا تھا ورنہ وہ خود پولیس کے طریقے سے پوچھ گچھ کرتا۔ وہ دوسرے کمرے میں پریشان ہو رہا تھا۔ میجر نے گومل سے پوچھا— ”کریم گنج میں راجن کے سرکس کو آگ لگی تھی۔ سُنا ہے راجن کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق تھا۔“

اس انگریز کی نسبت جنگلوں میں رہنے والا گومل عقلمند تھا۔ وہ بھانپ گیا کہ یہ صاحب جو کل جا کر آج پھر واپس آ گیا، یہ کھال کی خاطر ایک اور شیر کو مارنے نہیں آیا۔ گومل پیے ہوئے تھے۔ اُس کے پاس بندوق تھی۔ میجر کی رائفل ابھی بند پڑی تھی۔ گومل اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے بندوق کی نالی میجر پیٹر ہال کی طرف کر دی۔

"تم مجھے پکڑنے آئے ہو" گومل نے غصے سے کہا — "اور کہتے ہو کہ ایک دوست کے لیے شیر کی کھال لے جانی ہے۔ میں اُسے تمہاری کھال دوں گا... یہ گھوڑا راجن کے سرکس کا ہے۔ تم اب کریم گنج کی پولیس تک زندہ نہیں پہنچ سکو گے۔"

میجر پیٹر ہال کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں۔ اُس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اب جگموہن سنگھ تماشائی نہیں بنا رہ سکتا تھا۔ وہ جس دروازے کے ساتھ لگا کھڑا تھا، وہ گومل کے دائیں طرف تھا۔ جگموہن ریوالور ہاتھ میں لے کر دروازے سے آگے آ گیا اور گومل کی طرف ریوالور کر کے بولا — "رائفل نیچے کر لو گومل!"

گومل نے جگموہن کی طرف دیکھے بغیر گولی چلا دی۔ جگموہن اُسے ریوالور کی گولی سے ہلاک کر سکتا تھا لیکن اُسے زندہ پکڑنا زیادہ بہتر سمجھا۔ اُدھر گومل کی بندوق فائر ہوئی اِدھر سے جگموہن نے اُس کے ہاتھ پر ریوالور فائر کیا۔ فاصلہ بمشکل چار گز تھا۔ گولی گومل کے ہاتھ میں سے گذر گئی اور اُس کی بندوق گر پڑی۔ کانسٹیبل دوڑ سے آئے اور گومل کو جکڑ لیا۔

میجر پیٹر ہال کو دیکھا۔ اُس کی موت یقینی تھی کیونکہ گومل ماہر نشانہ باز تھا لیکن میجر زندہ تھا۔ کارتوس کے تھوڑے سے چھرے اُس کے کندھے میں اُس جگہ لگے تھے جہاں ہنسلی ختم ہوتی اور بازو شروع ہوتا ہے۔ باقی چھرے ایک طرف نکل گئے تھے۔

میجر کا اردلی اور دوسرا نوکر بھی آگیا تھا۔ میجر نے اپنا بیگ منگوایا جس میں فسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ گومل اب ہلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

میجر پیٹر ہال کے کندھے پر جگموہن نے پٹی باندھ دی۔ خون پوری طرح نہیں رُک رہا تھا۔ گومل کے ہاتھ پر بھی پٹی باندھ دی گئی جو کافی نہیں تھی۔ اُس کے ہاتھ میں سے گولی پار ہوگئی تھی۔ دونوں زخمیوں کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ لاری چار میل دُور سے ملتی تھی۔ میجر پیٹر ہال گومل کے مسروقہ گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ باقی سب کے لیے ٹٹو منگوائے گئے۔ لاری کے اڈے تک پہنچے۔ وہاں صرف ایک لاری خالی کھڑی تھی۔ لاری مسافروں سے بھر جاتی تو چلتی تھی۔ چونکہ ایمرجنسی تھی اور لاری ایک انگریز افسر اور پولیس کو درکار تھی، اس لیے وہ سب اس میں سوار ہوگئے اور لاری چل پڑی۔ گھوڑا کریم گنج تک پہنچانے کے لیے ایک کانسٹیبل کو اس پر سوار کیا گیا۔

پیار ملا تو درندوں سے ملا

پہلے ڈی۔ ایس۔ پی کے دفتر میں گئے۔ میجر پیٹر ہال کو وہاں کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا اور گومل کی مرہم پٹی کروا کے ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا کہ اسے کریم گنج لے جاؤ اور اس سے بیان لے کر شہادتیں اکٹھی کرو اور مقدمہ تیار کرو۔

کریم گنج لا کر جگموہن نے گومل سے کہا کہ وہ اب راجن کے قتل کا اعتراف نہ کرے تو بھی اُسے ایک انگریز افسر پر گولی چلانے کے جرم میں عمر قید دے کر کالا پانی (جزائر انڈمان) بھیج دیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے اُسے سزائے موت دے دی جائے۔

پھر کیوں نہ وہ راجن کے قتل کا اعتراف کرلے۔

گومل جنگلی تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اس جُرم میں اُسے سزائے موت یا عمر قید نہیں مل سکتی۔ جگموہن نے ڈرایا کہ کالاپانی کی عمر قید بڑی ظالم سزا ہے۔ وہ ہر روز مرے گا اور ہر رات زندہ ہوگا۔

"ایسی زندگی سے بہتر ہے کہ قتل کا اقبال کرلو اور پھانسی پاکر ایک ہی بار مرجاؤ"۔ جگموہن نے اُسے کہا۔ "تم جیسا دلیر اور غیرت مند آدمی عمر قید نہیں کاٹ سکے گا۔ اگر تم کالاپانی جاکر بیمار پڑ گئے تو تمہیں مرنے کے لیے جنگل میں پھینک دیا جائے گا یا سمندر میں پھینک دیں گے جہاں تمہیں مچھلیاں کھائیں گی"۔

اس طرح جگموہن نے اُسے بالکل غلط اور بڑی ہی ڈراؤنی باتیں سُنا سُنا کر اس قدر دہشت زدہ کر دیا کہ گومل نے بے اختیار کہا۔ "مجھے پھانسی کی سزا دلا دو"۔۔۔ پھر اُس نے جگموہن سے منّت کی کہ اُسے شراب منگوا دے۔ گومل پیتا بہت تھا۔

جگموہن نے شراب کی بوتل منگوالی اور گومل نے اقبالی بیان دینا شروع کر دیا۔

"مجھے بالکل یاد نہیں کہ میرا باپ کون تھا اور ماں کون تھی"۔ اُس نے کہا۔ "ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے جنگل کے جانوروں اور درندوں کے ساتھ پل کر جوان ہُوا ہوں۔ آپ کو اس سے تو کوئی غرض نہیں ہوگی کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ دس بارہ سال کی عمر میں اسی جنگل میں لوٹتا تو اسے چالیس میل دُور ایک بنگلے میں پنکھا ہلانے کے لیے نوکر ہُوا تھا"۔

اُس زمانے میں بجلی نہیں ہوتی تھی۔ چھت کے ساتھ بہت بڑے پنکھے لٹکا دیے جاتے تھے۔ لکڑی کا دو تین گز لمبا فریم ہوتا تھا۔ اس پر کپڑا چڑھا ہوتا تھا

اور اس کے نیچے دری کی طرح کا فریم جتنا لمبا اور نصف یا پَون گز چوڑا کپڑا لٹک رہا ہوتا تھا۔ لکڑی کے فریم کے ساتھ لمبی رسّی ہوتی تھی جو دروازے تک جاتی تھی ایک نوکر سارا دن اس رسّی سے پنکھا ہلاتا رہتا اور صاحب لوگ اور امیر کبیر لوگ پنکھے کے نیچے آرام سے سوتے رہتے تھے۔ انگریز ان ملازموں کو "پنکھا بوائے" کہا کرتے تھے۔

"خدا نے مجھے دماغ بھی اچھا دیا تھا۔ شکل بھی اچھی دی تھی اور جسم کو سختیاں سہنے کی طاقت اور صبر دیا تھا"۔ گوَل نے اپنے بیان میں کہا۔ "مجھے پیار اور محبّت کی بھی ضرورت تھی، روٹی اور کپڑے کی بھی ضرورت تھی۔ میں نے یہ سب ضرورتیں چالاکی اور ہوشیاری سے پوری کرنے کا ڈھنگ بچپن میں ہی سیکھ لیا تھا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں ایک انگریز شکاری کی مہربانی سے مجھے پہلے شیر کے شکار پر اُس کا سامان اُٹھا کے لے جانے کا موقع ملا۔ اس کے بعد میں نے اسی کام میں مہارت حاصل کر لی اور اسی عمر میں ایک ایسے استاد کی شاگردی کر لی جو جنگل کا چور تھا۔ وہ پھندے لگا کر ہرنوں اور بارہ سنگوں اور شیروں کو پکڑتا، انہیں زہر دے کر مارتا اور اُن کی کھالیں اُتار کر شہروں میں بیچ آتا تھا۔ یہ بہت بڑا جرم تھا...

"میں نے اُستاد کو اس طرح خوش کیا تھا کہ نیپال کے جنگل کی ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی کو جس کی عمر سولہ سترہ سال تھی، ورغلا کر گھر سے نکالا اور اُسے استاد کے حوالے کر دیا تھا۔ استاد نے مجھے اپنے پیشے کے سارے داؤ پیچ سکھا دیے۔ میں جرم بھی کرتا رہا اور جو انگریز اور جو راجے مہاراجے شکار کھیلنے آتے تھے، کے ساتھ بھی اُجرت اور انعام پر جاتا رہا۔ اسی دوران میں نے رائفل اور بندوق چلانی سیکھی۔ جنگل کے ایک گاؤں کے نمبردار نے مجھے اپنا پہرہ دار بنا لیا۔

اُس کی دو بیویاں تھیں۔ وہ جنگل کا بادشاہ تھا۔ اُس کی ایک بیوی جوان تھی۔ وہ مجھ پر مہربان ہو گئی۔ میں جتنا عرصہ وہاں رہا، نمبردار اس راز سے واقف نہ ہو سکا۔ نمبردار کے ساتھ مل کر بھی میں نے بہت جُرم کیے ....

"میرے دل میں درندوں کا پیار پیدا ہو گیا۔ میں شیروں اور بھیڑیوں کے بچے اُٹھا لاتا تھا اور انہیں بڑے پیار سے اپنے ساتھ مانوس کر لیتا تھا۔ میں نے شادی کی کبھی سوچی ہی نہیں ... چند اور سال گذرے تو میں جنگل کا استاد بن گیا اور اب مجھے کسی کے سائے اور سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ماہر شکاری اور انگریز شکاریوں کا مددگار بن گیا۔ جنگل کے سرکاری کارندوں اور ٹھیکیداروں سے بھی میری دوستی ہو گئی۔ میں سرکسوں اور چڑیا گھروں کو شیر وغیرہ سپلائی کرتا رہا۔ نوابوں اور مہاراجوں کی فرمائش کے پرندے اور جانوروں کے بچے انہیں دے کر بہت پیسہ کمایا۔ یہ پیسہ شراب پر اور من پسند عورتوں پر خرچ ہوتا رہا ....

رقم لڑکی کو دے دی اور ...

"راجن سے اس سلسلے میں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اُسے میں نے لنگور اور بندر دیے۔ میں بچے چوری کیا کرتا اور انہیں اپنے پاس رکھا کرتا تھا اس لیے یہ میرے ساتھ مانوس ہو جاتے تھے۔ میں انہیں جو حرکتیں سکھاتا وہ کرنے لگتے تھے۔ اس طرح مجھے جانوروں کو سدھانے کا تجربہ ہو گیا۔ راجن میں یہ خرابی تھی کہ پیسے ترسا ترسا کر دیتا تھا اور اکثر پیسے ہضم کر جاتا تھا۔ اُس کی مجھے یہ بات پسند

تھی کہ ولائتی شراب پلاتا تھا اور میرے ساتھ محبّت بہت کرتا تھا۔۔۔۔

"میں نے اُسے شیر کا ایک بچّہ لاکر دیا۔ اُس نے پیسے جلدی دینے کا وعدہ کیا تھا مگر اُس نے ٹرخانا شروع کردیا۔ بچّے کو میں نے تین چار مہینے اپنے پاس رکھا تھا اس لیے وہ میرے سوا کسی اور کو قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ راجن نے کہا کہ اسے میں ہی سدھاؤں۔ میں نے ایک سال سرکس کے ساتھ رہ کر شیر کو سدھایا اور یہ تماشہ دکھانے لگا۔ راجن نے مجھے ولائتی شراب، اچھے سے اچھا کھانا اور الگ خیمہ دیا، پیسہ ایک بھی نہ دیا۔ دوستی اور پیار محبّت میں ٹرخاتا رہا۔۔۔۔

"ایک رات میں نے شراب پی ہوئی تھی۔ میں راجن کے خیمے سے اپنے خیمے کو جارہا تھا۔ سرکس کی ایک لڑکی سامنے آگئی۔ میں انسان تو ہوں نہیں، میں جنگل کے جانوروں اور درندوں میں جنا پلا ہوں۔ میں لڑکی کو بازوؤں پر اٹھا کر اپنے خیمے میں لے گیا۔ وہ شور مچا رہی تھی۔ سرکس کے آدمی آگئے اور لڑکی کو چھڑا کر لے گئے۔ راجن کو پتہ چلا تو وہ دوڑا آیا۔ اُس نے مجھے گالیاں دیں۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ مجھے شیر کی قیمت اور اسے سدھانے کی اُجرت دے دے، میں چلا جاؤں گا۔ اُس نے مجھے تھوڑے سے پیسے دیے اور کہا کہ ایک مہینے بعد آکر رقم لے جانا۔۔۔۔

"میں سرکس سے چلا گیا اور کبھی کبھار آتا رہا۔ اس شیر کے ساتھ میری دوستی گہری ہوگئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کتّوں جیسی حرکتیں کرتا تھا۔ ایک بار میں نے اُسے پنجرے سے نکال لیا اور وہ میرے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ جوان شیر کو باہر نکالنا خطرناک تھا لیکن شیر میری محبّت میں بھول ہی گیا تھا کہ وہ شیر ہے۔ راجن نے بہت چکر دیے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میری رقم ہضم کرنا چاہتا ہے۔ میں نے

ارادہ کیا تھا کہ اس رقم کو بھول جاؤں گا لیکن مجھے رقم کی ضرورت تھی اور ضرورت یہ تھی کہ ایک گاؤں میں ایک بڑی خوبصورت لڑکی جوان ہو گئی تھی لیکن اُس کے ماں باپ اتنے غریب تھے کہ اُس کی شادی کے لیے اُن کے پاس کچھ بھی نہیں تھا....

"میں کہاں کا شریف آدمی تھا لیکن ایک روز اس لڑکی کا باپ مجھے ملا۔ اُس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر اور رو کر کہا کہ گومل، کچھ قرض ہی دے دو۔ لڑکی کی شادی نہ ہوئی تو ایک بدمعاش اُسے پریشان کر رہا ہے جس کا ہم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں نے اُسے کہا کہ تمہاری لڑکی کی شادی میں کراؤں گا۔ میں نے سب سے پہلے اس بدمعاش کو پکڑا اور اُسے مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ اُس وقت سارے جنگل میں میری دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ میں اُسے رقم لا دوں گا....

"رقم راجن کے پاس تھی۔ اُس کا سرکس کریم گنج آ چکا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس سرکس کا سُراغ لگایا تھا۔ راجن سے کہا کہ اب مجھے پوری رقم کی ضرورت ہے۔ وہ پھر ٹرخانے لگا۔ اُس نے مجھے ولایتی شراب پلائی۔ میں نے اُسے کہا کہ تم کہہ دو کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں، میں تمہیں رقم معاف کر دوں گا۔ وہ مجھے ٹالتا رہا۔ مجھے غصّہ آ گیا۔ ایک وہ غریب لڑکی ہے جس کی شادی نہیں ہو سکتی کہ اُس کے ماں باپ کے پاس پیسے نہیں، اور ایک یہ آدمی ہے جس کے پاس روپوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور وہ پھر بھی دوسروں کا حق مار رہا ہے....

"میں نے اُسے غصّے سے کہا کہ میں آج رقم لے کر جاؤں گا۔ اُس نے مجھ سے زیادہ غصّے سے کہا کہ جا، جنگلی! ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ مجھے دھونس دکھاتے

ہو؟... میں اُس کے خیمے سے نکل آیا لیکن قریب ہی ویرانے میں گھومتا پھرتا رہا۔ آدھی رات تو ہو چکی تھی۔ جب دیکھا کہ سرکس کے لوگ تھکے ہُوئے گہری نیند سو گئے ہیں اور بتیاں بُجھ چکی ہیں تو واپس آگیا۔ چوری چھُپے راجن کے خیمے میں داخل ہو گیا۔ اُس کے لیمپ کی بتی مدھم تھی۔ میں نے سب سے پہلے اُسی کا رومال اُس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس کی آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ وہ اُٹھا۔ میں نے اُس کا بازو مروڑ کر اُسے فرش پر اوندھے مُنہ گرا لیا۔ آپ میرا جسم دیکھ رہے ہیں۔ اس جسم میں بہت طاقت ہے....

”میں پورا انتظام کر کے آیا تھا۔ میرے پاس رسّی تھی۔ میں نے اُس کی پیٹھ پر اپنے گھٹنے دبا کر اُس کے ہاتھ پیٹھ پر رسی سے باندھ دیے۔ پھر اُس کے پاؤں بھی رسّی سے باندھے۔ اُس کا لیمپ بڑا تھا۔ میں نے اس کا ڈھکنا کھول کر تیل راجن پر چھڑک دیا۔ خیمے پر بھی تیل چھڑکنا تھا لیکن لیمپ شام سے جل رہا تھا، اس میں تیل کم رہ گیا تھا۔ میں نے راجن کا بکس کھولا۔ اس میں شراب کی دو بوتلیں رکھی تھیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ شراب تیل کی طرح آگ پکڑتی ہے۔ میں نے بکس کی تلاشی لی۔ اس میں بہت رقم پڑی تھی۔ راجن کو اتنا یقین تھا کہ اُس کے خیمے میں چوری نہیں ہو سکتی کہ اُس نے بکس کو تالا نہیں لگایا تھا، یا شاید شراب کے نشے میں وہ تالا لگانا بھُول گیا تھا....

”میں نے شراب کی دونوں بوتلیں نکال لیں۔ رقم میں سکّے زیادہ تھے۔ میں نے پانچ اور دس روپے کے جتنے نوٹ تھے، نکال کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیے۔ شراب کی بوتلیں کھولیں اور شراب خیموں کے اندرونی کپڑے پر چھڑک دی۔

چارپائی اور میز پر بھی چھڑکی۔ ماچس جلا کر پہلے راجن کے کپڑوں کو آگ لگائی۔ اس کے ساتھ ہی بھک ہوئی اور سارے خیمے کو آگ لگ گئی۔ یہ شراب کی وجہ سے آگ لگی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے ہوگا۔ میں فوراً باہر نکل گیا۔ میرے ہاتھ میں شراب کی ابھی ایک بوتل تھی۔ اسے کھول کر میں نے ذرا پرے ایک اور خیمے پر شراب چھڑکی اور آگ لگا دی اور میں سرکس کے بڑے خیمے کے پیچھے چلا گیا....

"ہوا بہت تیز تھی۔ آگ فوراً پھیل گئی اور سرکس کے لوگ جاگ اُٹھے۔ ایسی ہڑبونگ اور افراتفری مچی کہ کسی کو کسی کا ہوش اور خیال نہ رہا۔ بھگدڑ تھی۔ آگ پر پانی پھینکنے کی بجائے لوگ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آگ اس طرح پھیلے گی۔ میری نظر اس گھوڑے پر تھی۔ میں اُس طرف چلا گیا جہاں جانور بندھے ہوئے تھے۔ میں نے بڑے آرام سے گھوڑے کے پاؤں کا پٹہ کھولا اور اُس طرف نکل گیا جدھر اندھیرا تھا۔ میں محفوظ فاصلے پر پہنچ گیا تو مجھے شیروں کی گرج سُنائی دی۔ مجھے اپنے شیر کا خیال آ گیا۔ میں سمجھا کہ آگ شیروں اور چیتوں کے پنجروں تک پہنچ گئی ہے اور اُن کے ڈر سے کوئی اُن کے پنجرے کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا اور یہ درندے زندہ جل جائیں گے....

"میں نے گھوڑا ایک درخت کے ساتھ باندھا اور سرکس کی طرف دوڑ پڑا۔ اب سرکس کے آدمی تالاب سے پانی لا رہے تھے۔ میری واردات ہر طرح کامیاب ہو رہی تھی۔ جہاں پنجرے تھے وہاں اندھیرا تھا۔ آگ دُور تھی اور آگ اور پنجروں کے درمیان سرکس کا بڑا خیمہ تھا جو بہت وسیع اور گول ہوتا ہے۔

لوگ پانی دوسری طرف سے لا رہے تھے۔ میں اپنے شیر کے پنجرے کے اُوپر جا کر اس کا دروازہ کھولنے کی بجائے اُس کے سامنے چلا گیا اور آہستہ سے آواز دی۔ "تارا"۔ میرے شیر کا نام تارا تھا۔ اُس نے میری آواز پہچان لی۔ میں نے پنجرے کا دروازہ اُٹھایا اور شیر کے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ وہ باہر کود آیا۔ میں نے اُسے زندہ جلنے سے بچا لیا تھا....

"میں گھوڑے تک گیا اور اُس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ شیر ساتھ تھا۔ کوئی جانور شیر کے قریب نہیں ٹھہر سکتا۔ گھوڑے تو شیر کی بُو پا کر سرپٹ دوڑ پڑتے ہیں لیکن یہ گھوڑا شیروں کی بُو اور اُن کی دن رات کی گرج اور دھاڑ کا عادی تھا اس لیے نہ ڈرا....

"میں صبح سے پہلے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا جو گھنے جنگل میں تھا۔ شیر میرے جھونپڑے کے باہر گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اپنا شکار مار کر کھا آتا تھا۔ دو تین دنوں بعد شیر کہیں نکل جاتا تھا۔ میں گھوڑے پر بیٹھا اور وہ تمام رقم جو مہاجن کے بکس سے نکالی تھی اُس لڑکی کے باپ کو جا دی جس کی شادی غربت کی وجہ سے رُکی ہوئی تھی۔ شیر نے کوئی ایک مہینہ میرا ساتھ دیا۔ ایک رات اُسے ایک شیرنی کی آواز سُنائی دی۔ میں اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ شیرنی کسی شیر کو پکار رہی تھی۔ تارا اس آواز پر دوڑ پڑا۔ اس کے بعد میں نے اُسے اُس وقت دیکھا جب یہ انگریز افسر (میجر پیٹر ہال) شکار کے لیے گیا تھا....

"میرا شیر جوان ہو گیا تھا اور اس کی جوانی تنہائی میں گذر رہی تھی۔ آپ شاید حیران ہو رہے ہوں گے کہ ایک شیر ایک انسان کے ساتھ کتے کی طرح پیار کرتا تھا۔

میں جنگل کے جانوروں اور درندوں کی فطرت سے واقف ہوں۔ یہ شیر جب چند دنوں کا بچہ تھا تو اسے میں اُٹھا لایا تھا۔ اسے میں اپنے ساتھ سُلاتا اور دُودھ پلاتا تھا۔ سرکس میں لے جا کر میں ایک سال سے زیادہ عرصہ اس کے ساتھ رہا اور اسے انسانی بچوں کی طرح گود میں اُٹھاتا، کھلاتا پلاتا اور کرتب سکھاتا رہا۔ پھر یہ بڑا ہوا تو اس کا واسطہ انسانوں کے ساتھ رہا اس لیے یہ انسان کو اپنا دشمن یا اپنا شکار نہیں سمجھتا تھا، مگر شیرنی کی ایک خاص آواز نے اسے جنگل کا شیر بنا دیا اور مجھ سے جدا ہو گیا....

"تقریباً دو مہینے بعد مجھے نزتانزا کے ڈاک بنگلے میں اس انگریز افسر کو شکار میں مدد اور راہنمائی دینے کے لیے بُلایا گیا۔ ظاہری طور پر یہی میرا پیشہ تھا۔ میں وہاں گیا تو پتہ چلا کہ ایک شیر نے رات کو مویشیوں کے باڑے پر حملہ کیا ہے۔ میں نے جا کر زمین پر شیر کے پگ (پنجوں کے نشان) دیکھے تو میں نے اپنے شیر تارا کو پہچان لیا۔ اس کے پگ تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ میں درندوں کے پگ پہچاننے کا ماہر ہوں....

"میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ شیر مارا جائے۔ میں نے صاحب سے کہا کہ اسے زندہ پکڑ کر اپنے پاس رکھنے کی کوشش کروں گا اور اگر یہ میرے پاس رہ گیا تو کسی نواب یا مہاراجے کو دے آؤں گا۔ بڑی اچھی قیمت مل سکتی تھی، لیکن شیر پنجرے میں یعنی پھندے میں نہ آیا....

"میں نے یہ بھی کوشش کی کہ اس انگریز شکاری کو جنگل کے کسی دوسرے حصے میں لے جاؤں اور وہ کوئی اور شیر مارے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ جنگل بلاکوں میں تقسیم ہے اور اس انگریز کو صرف اس بلاک کا اور صرف ایک شیر مارنے کا لائسنس

ملا تھا۔ دوسرے دن اس شیر نے ایک اور آدمی کو مار ڈالا لیکن اُسے کھایا نہیں۔ وہ بد قسمت آدمی اُس کے شکار کے آگے آگیا ہوگا۔ انگریز شکاری نے کہا کہ وہ اسی شیر کو مارے گا۔ دراصل شیر وہاں سے چار پانچ میل دُور تھے۔ میرا شیر اس علاقے میں اکیلا آگیا تھا...

"اس کے دن پورے ہو گئے۔ ہم نے اس کا تعاقب کیا تو صاحب نے اناڑیوں کی طرح گولی چلا کر اسے زخمی کر دیا۔ اس سے یہ شیر بہت خطرناک ہوگیا تھا۔ ایک جگہ پھر شیر نظر آیا تو صاحب نے پھر گولی چلا دی۔ میں دوسری طرف تھا جہاں سے مجھے شیر اچھی طرح نظر آرہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ شیر کو دوسری گولی نے بھی صرف زخمی کیا ہے اور یہ زخم اُسے تڑپا تڑپا کر دو تین روز بعد ماریں گے تو میں نے اس کے پہلو پر گولی ماری تاکہ گولی اُس کے دل میں اُتر کر اسے فوراً ختم کر دے۔ میں نے اپنے شیر کو اذیت کی موت سے بچا لیا۔ مجھے بہت صدمہ ہُوا۔ صاحب اس کی کھال لے کر چلا گیا تو میں اکیلے جا کر بہت رویا...

"اس شکاری کے جانے کے دو ہی روز بعد مجھے پھر نوتا نوا کے ڈاک بنگلے میں بلایا گیا تو میں نے دیکھا کہ یہ تو وہی صاحب ہے جو کل پرسوں یہاں سے گیا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اُس نے میرے ساتھ کیا باتیں کی تھیں۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہو گیا کہ سرکس کے گھوڑے نے جو میرے پاس تھا میرا راز فاش کر دیا ہے اور یہ صاحب جاسوسی کرنے آیا ہے۔ میں بچہ یا اناڑی نہیں تھا۔ اُس نے سوال ہی ایسے پُوچھے کہ میں بھانپ گیا کہ یہ کیوں آیا ہے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی اشارہ مل جاتا کہ ڈاک بنگلے میں پولیس بھی موجود ہے تو میں فرار ہو جاتا پھر دیکھتا کہ کون مجھے

اس جنگل میں ڈھونڈتا ہے۔ میں ڈھونڈنے والوں کو ایک ایک کر کے گولی کا نشانہ بنا دیتا....

"مجھے اس صاحب پر غصہ آ گیا۔ میں سمجھا وہ اکیلا ہے۔ مجھے اس پر اس لیے بھی غصہ آیا تھا کہ اس نے میرے شیر کو اس طرح زخمی کیا تھا کہ شیر میرے ہاتھوں مرا۔ میں اس انگریز کو گولی مار کر بھاگ جانے کے ارادے سے اُٹھا تھا۔ میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا تھا تاکہ اس کا مغز اُڑ جائے مگر آپ نے مجھے اُس وقت للکارا جب میں گولی چلانے لگا تھا۔ آپ کی آواز سے میرا نشانہ چوک گیا۔ میں آپ کو بھی گولی مارنا چاہتا تھا لیکن آپ نے اس سے پہلے ہی میرے ہاتھ پر گولی چلا دی۔"

جگموہن سنگھ نے اس کا اقبالی بیان ایک مجسٹریٹ سے قلمبند کروا لیا۔ گرمل نے عدالت میں بھی اقبالِ جُرم کیا اور اُسے سزائے موت دے دی گئی۔

جہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں

بارات کے ساتھ مجھے بھی جانا پڑا۔ میں خوش تھا کہ بہت عرصے بعد تفتیش اور تھانے سے نجات ملی۔ اعصاب تھکے ہوئے تھے۔ دماغ دکھ رہا تھا۔ یہ بارات میرے لیے دوا کا اثر رکھتی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ جہاں بارات جا رہی ہے وہاں رات کو قوالی ہو گی اور دلّی کی ایک گانے والی کا مجرا بھی ہو گا۔ میں تو فراغت کو ترس رہا تھا مگر بارات کے ساتھ دلہن کے گھر پہنچے تو ایک کی بجائے دو قتل ہو گئے۔ قوالی اور مجرا دھرا رہ گیا اور ساری رات قاتلوں کے پیچھے دوڑتے گذر گئی۔ وہ تھانہ میرا نہیں تھا لیکن مجھے تفتیش اور تعاقب میں پورا پورا ساتھ دینا پڑا۔

بارات ایک مسلمان جاگیردار کے بیٹے کی تھی۔ یہ جاگیردار انگریزوں کا پروردہ تھا۔ اس کے دو بیٹے فوج میں تھے۔ ایک کیپٹن دوسرا لیفٹیننٹ۔ وہ جہاں کا رہنے والا تھا، میں وہاں کے تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او رہ چکا تھا۔ اس دوران اس جاگیردار کے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ اب میں تیس میل دور ایک تھانے میں چلا گیا تھا۔ جاگیردار نے ایک آدمی کے ذریعے

پیغام بھیجا کہ میں بارات کے ساتھ ضرور چلوں۔ ایک تو دوستی ایسی تھی کہ میں ٹال نہ سکا اور ٹال نہ سکنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے تفریح اور ذرا سی فراغت کی ضرورت تھی۔

میں اُس کے ہاں چلا گیا۔ اُس کے جس بیٹے کی شادی ہو رہی تھی وہ اوباش اور عیّاش نوجوان تھا۔ اُس کا نام تو کچھ اور تھا، میں اُسے دولہا ہی لکھوں گا۔ وہ شادی سے پہلے بھی دولہا ہی بنا رہتا تھا۔ میں اُس کے باپ سے کہا کرتا تھا کہ اسے بھی فوج میں کمیشن دلا دو یا اس کی شادی کر دو۔ وہ اکثر دِلّی جاتا رہتا تھا۔ وہ صرف عیش و عشرت کے لیے جاتا تھا۔ اُس کے باپ کے پاس زمین اور دولت کا کچھ حساب نہ تھا۔ وہ میری بات نہ سمجھ سکا۔ ہم جسے شہزادہ کہا کرتے ہیں اسے ہندو راجکمار کہتے ہیں۔ باپ اپنے بیٹے کو بڑے فخر سے راجکمار کہا کرتا تھا۔ راجکمار مہاراجوں کے اُن بیٹوں کو کہا کرتے تھے جنہیں مہاراجوں کا جانشین بننا ہوتا تھا۔ اس مسلمان جاگیردار پر چونکہ انگریزوں اور ہندوؤں کا اثر زیادہ تھا، اس لیے وہ بیٹے کو شہزادہ کی بجائے راجکمار کہتا تھا۔

باپ کو آخر خیال آگیا۔ اُس نے اپنے راجکمار کے لیے اپنے جیسے ایک جاگیردار کی بیٹی کے ساتھ رشتہ طے کر لیا۔ لڑکی والے چالیس میل دُور رہتے تھے۔ وہ بھی گاؤں تھا اور اُس گاؤں پر لڑکی کے باپ کی حکمرانی تھی۔ وہ بھی انگریزوں کا منظورِ نظر تھا۔ بارات کو رات وہیں ٹھہرنا تھا۔ آج کل بارات کو فوراً چھٹی دے دی جاتی ہے۔ رات رکھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

اُس زمانے میں بارات کو رات نہ رکھنا اپنی اور لڑکے والوں کی توہین سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ تو روپے پیسے والے تھے۔ بارات کو کئی راتیں رکھ سکتے تھے۔

بارات پانچ بسوں پر گئی۔ بسوں کی چھتوں پر بھی باراتی سوار تھے۔ اُس دَور میں بسوں کی یہ افراط نہیں تھی جو آج ہے۔ چونکہ جاگیردار دولت مند تھا اس لیے اُس نے دِلّی سے بسوں کا انتظام کرلیا تھا۔ لڑکی والوں کے گاؤں پہنچے تو سارا گاؤں دلہن بنا ہُوا تھا۔ میں نے اتنی رونق شاید ہی کسی شادی پر دیکھی ہو گی۔ دونوں فریق دولت اور جاگیرداری کی خوب نمائش کر رہے تھے۔ عجیب چیز یہ دیکھی کہ لڑکی والوں نے قوّالی اور مُجرے کا انتظام کر رکھا تھا۔ بھانڈوں اور نٹوں کے تماشے کا بھی اہتمام تھا۔

ایک گیت دو غزلیں اور قتل

نکاح ہو گیا۔ بھانڈوں اور نٹوں نے خوب رونق پیدا کی۔ قوّال آ چکے تھے۔ گانے والی شام سے ذرا پہلے آئی۔ وہ دِلّی کے اجمیری گیٹ کی دُنیا کی باسی تھی۔ یہ طوائفوں کا بازار تھا جہاں ناچنے اور گانے والیاں بھی اپنا کاروبار کرتی تھیں۔ ان میں اُونچے درجے کی بھی ہوتی تھیں، درمیانہ درجے کی اور بالکل تھرڈ کلاس بھی ہوتی تھیں جنہیں لوگ بیاہ شادیوں پر لے جایا کرتے تھے۔ قمر بائی درمیانہ درجے کی ایک گمنام سی گانے والی تھی۔ وہ جوانی کی عمر میں تھی اور بہت خوبصورت تھی۔ اُس کے جسم میں عجیب سی کشش تھی۔ جو کسر رہ

جاتی تھی، وہ ناز و انداز اور مُسکراہٹ سے پوری کر لیتی تھی۔

میں اُسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی حُسن کا شاہکار تھی۔ میرا خیال تھا کہ اُس کا گانا بھی اُس کے حسن و جوانی جیسا ہو گا، مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ اُس نے ایک گیت اور دو غزلیں سُنائیں۔ اُس کی آواز واجبی سی تھی۔ لوگوں نے اُس پر روپوں کا مینہ برسا دیا۔ یہ ویلیں دکھاوے کے لیے دی جا رہی تھیں جیسا کہ آپ اکثر شادیوں میں دیکھا کرتے ہیں... دولہا تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانچ روپے کا نوٹ نکالتا، ہوا میں لہراتا اور قمر بائی نازک سے پودے کی ڈالی کی طرح جھومتی لہراتی آتی اور طلسماتی سی مسکراہٹ سے نوٹ لے کر چلی جاتی۔۔ دولہا کا باپ اور دلہن کا باپ بھی اسی طرح نوٹ پہ نوٹ پھینک رہے تھے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ اُس دَور کا پانچ روپے کا نوٹ آج کے سَو روپے کے برابر تھا۔

قمر بائی کی نائکہ نے (جو گانے والیوں کے ساتھ ہُوا کرتی ہے) کہا کہ بائی ذرا آرام کر لیں۔ گاتے گاتے اور اُٹھ اُٹھ کر ویلیں وصول کر کر کے تھک گئی ہیں۔ چنانچہ طے ہُوا کہ قوّالی شروع کر دی جائے اور اس کے بعد قمر بائی گانا سُنائے گی اور رقص بھی کرے گی۔

قمر بائی اپنی نائکہ اور سازندوں کے ساتھ محفل سے اُٹھ کر چلی گئی۔ اُس کے لیے الگ کمرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ قوّالوں نے محفل جمائی۔ میں نے دیکھا کہ قمر بائی کی نائکہ اور سازندے قوّالی سُننے کے لیے آ گئے۔ قوّالی ابھی شروع ہوئی ہی تھی کہ ایک آدمی نے لڑکی کے باپ کے کان میں کچھ کہا۔ اتفاق سے

میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے لڑکی کے باپ کو چونکتے اور گھبرا کر اُٹھتے دیکھا۔ اُس نے دولہا کے باپ کے کان میں کچھ کہا۔ وہ بھی گھبرا کر اُٹھا اور مہمانوں کو دیکھا۔ اُس کی نظر مجھ پر پڑی تو دوڑا آیا۔

"ملک صاحب!" اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ـــ "قمر بائی قتل ہو گئی ہے۔"

میرا ذہن محفلِ موسیقی سے اُچھل کر تھانے جا پہنچا جیسے تھانے میں کوئی مجھے قتل کی رپورٹ دے رہا ہو۔ مجھے اطمینان صرف اتنا ہُوا کہ وہ تھانہ میرا نہیں تھا اور یہ کیس بھی میرا نہیں تھا لیکن تھانیدار ہوتے ہُوئے میں اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ اس تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او ایک ہندو سب انسپکٹر راجیش نندہ تھا۔ خوبصورت جوان اور بہت قابل پولیس آفیسر تھا۔ دماغ کا تیز اور جسم کا پھرتیلا تھا۔ وہ اُن آدمیوں میں سے تھا جو آج کا کام کل پر ملتوی کرنے کی بجائے کل کا کام بھی آج ہی کر لیا کرتے ہیں۔ بڑے امیر ماں باپ کا بیٹا تھا اس لیے اُس میں لالچ کم تھا۔ اُس نے رشوت کا ریٹ اتنا اونچا مقرّر کر رکھا تھا کہ ہر کوئی اُس سے اپنا کام نہیں کرا سکتا تھا۔ اُس کا مطالبہ کوئی جاگیردار یا ٹھیکیدار ہی پُورا کر سکتا تھا۔

راجیش لڑکی والوں کی طرف سے مدعو تھا۔ وہ عام ہندوؤں سے مختلف آدمی تھا۔ اُس نے کھانا ہمارے ساتھ کھایا اور بڑے مزے سے گوشت کھاتا رہا تھا۔ وہ تنگ نظر نہیں تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھا تھا۔ دولہا کے باپ نے مجھے کہا کہ قمر بائی قتل ہو گئی ہے تو راجیش مجھ سے

پہلے اُٹھا اور پوچھا۔ "کہاں؟"
"کمرے میں۔"

تحصیلدار بھی ہار گیا

قوّالی روک دی گئی۔ لڑکی اور لڑکے کے باپ حویلی کی طرف دوڑے۔ میں اور راجیش اُن کے ساتھ گئے۔ دولہا بھی اُٹھ دوڑا۔ ذرا سی دیر میں ہڑبونگ مچ گئی۔ دھماکے کی طرح خبر لوگوں میں پھیل گئی کہ گانے والی قتل ہو گئی ہے۔ وہاں لوگ تھوڑے نہیں تھے۔ دُور دُور سے تماشائی آئے ہوئے تھے۔ وہ سب حویلی پر ٹوٹ پڑے۔ اُن کے لیے گانے والی کے گانے کی نسبت اُس کے قتل کا تماشہ زیادہ دل چسپ اور سنسنی خیز تھا۔ اس ہجوم پر قابو پانا ناممکن تھا۔

حویلی وسیع و عریض تھی۔ ایک طرف باغیچہ سا تھا جس کے دو طرف دیوار تھی اور دو طرف برآمدے اور کمرے تھے۔ یہ مہمانوں کے لیے تھے۔ قمر بائی اور قوّالوں کو انہی کمروں میں سے کمرے دیے گئے تھے۔ میں اور راجیش جب اس حصّے کے دروازے میں داخل ہوئے تو لوگ ہمارے راستے میں آ رہے تھے۔ کسی کی راہنمائی میں ہم اُس کمرے میں پہنچے جہاں فرش پر قمر بائی کی لاش پڑی تھی۔ خون اتنا کہ دروازے تک آ گیا تھا۔

میں نے اور راجیش نے لاش کو پیٹھ کے بَل کیا۔ پیٹ چاک تھا اور

انتڑیاں وغیرہ باہر آکر بکھر گئی تھیں۔ ایک زخم دل کے مقام پر تھا۔ خنجر یا چاقو استعمال کیا گیا تھا۔ ہم دونوں نے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ حسین مغنیہ اُسی لباس میں تھی جو پہنے ہوئے اُس نے گانے سُنائے تھے۔ لباس پھٹا ہُوا یا اُترا ہُوا نہیں تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُسے صرف قتل کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے اس کے ساتھ کوئی اور زیادتی یا چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی۔ اُس کے گلے میں قیمتی ہار تھا۔ انگلیوں میں سونے کی دو انگوٹھیاں، کانوں میں سونے کے جُھمکے اور کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔ ہر ایک چیز جسم پر موجود تھی۔ پلنگ پر اُس کا پرس پڑا تھا۔ کھول کر دیکھا۔ نوٹوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ ویلوں کی رقم تھی۔

"عداوت یا رقابت"۔ راجیش نے کہا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ یہ بات صاف تھی کہ قاتل کو مقتولہ کے نہ حسن و جوانی کے ساتھ کوئی دلچسپی تھی نہ اُس کے زیورات اور رقم کے ساتھ۔ وہ اُسے قتل کرنے آیا تھا، قتل کر گیا۔ یہ بھی واضح تھا کہ قاتل بہت دلیر تھا یا کوئی اس حویلی کا رہنے والا تھا جو اطمینان سے اندر آیا اور قتل کر گیا۔

ہم لاش کو دیکھ رہے تھے۔ اُسے اُلٹا پلٹا کر دیکھا۔ باہر حویلی کے اندرونی باغیچے اور برآمدوں میں جو شور و غل تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ تماشائیوں کا سارا ہجوم اندر آگیا ہے۔ اچانک ایک بلند اور گھبرائی ہوئی آواز سُنائی دی ـــ "مار گیا.... اِدھر آنا" ـــ اور بھگدڑ مچ گئی۔ میں اور راجیش کمرے سے نکلے۔ ایک آواز کانوں میں پڑی ـــ "تحصیلدار صاحب کو چاقو مار

گیا ہے۔"

باغیچے کی دیوار کا ایک ہی دروازہ تھا۔ میں ہجوم کو چیرتا تماشائیوں کو گھونسے، کندھے اور ٹھڈے مارتا دروازے تک گیا اور دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ راجیش کو آواز دی۔ وہ بھی ہجوم میں سے بڑی مشکل سے مجھ تک پہنچا۔ وہاں روشنی کم تھی۔ صرف دو لیمپ جل رہے تھے جن کی روشنی ہجوم نے روک رکھی تھی۔

"راجیش!" — میں نے کہا — "دو تین چار آدمی یہاں لاؤ جو کسی کو باہر نہ نکلنے دیں۔"

اس نے کچھ نام پکارے۔ میں نے بڑی بلند آواز سے کہا۔ "تمام آدمی جہاں جہاں کھڑے ہیں وہیں بیٹھ جائیں اور خاموش ہو جائیں ورنہ ہم گولی چلا دیں گے۔"

گولی چلانے کے لیے نہ میرے پاس کچھ تھا نہ راجیش کے پاس۔ ہجوم بیٹھنے لگا۔ تین چار آدمی میرے پاس دروازے پر آ گئے۔ میری سکیم یہ تھی کہ دروازے سے ایک ایک آدمی کی تلاشی لے کر باہر نکالا جائے۔

"ملک صاحب!" — راجیش نے کہا — "چل کے دیکھو تو سہی تحصیلدار زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ ہم نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ ہوا کیا ہے۔" اس نے ان آدمیوں کو جو اس نے بلائے تھے، سختی سے کہا — "کسی کو باہر نہ نکلنے دینا خواہ کوئی اس حویلی میں رہنے والا ہی ہو۔"

باغیچہ خاصا وسیع تھا۔ اس میں پودے تھے اور گھاس کے پلاٹ بھی

اور اس میں درخت بھی تھے۔ میں راجیش کے ساتھ اُس برآمدے میں گیا
جہاں کہتے تھے کہ تحصیلدار زخمی پڑا ہے۔

تعاقب بیکار تھا

کچھ آدمی اِرد گرد بیٹھے تھے اور ان کے درمیان تحصیلدار پڑا تھا۔ ایک
نبض پر میں نے ہاتھ رکھا، دوسری پر راجیش نے۔ وہ زندہ تھا۔ وہ پیٹھ کے
بل پڑا تھا اور اُس کا بھی پیٹ قمر بائی کی طرح چاک تھا۔ پیٹ کے اندرونی
حصّے باہر آ گئے تھے۔ اُسے فوری طور پر ہسپتال لے جانا بیکار تھا۔ اُس
کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں اُس کا نزعی بیان لینا تھا۔
"آپ کو کس نے زخمی کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
جواب میں وہ اپنا ایک ہاتھ مونچھوں تک لے گیا اور انگلیوں سے
مونچھیں مروڑنے کا اشارہ کیا۔ اُس کی مونچھیں بہت چھوٹی تھیں۔ میں اشارہ
سمجھ گیا۔ قاتل کی مونچھیں بڑی اور مروڑ مروڑ کر نوکدار کی ہوئی تھیں۔ تحصیلدار
کے ہونٹ ہلے۔ میں نے کان اُس کے مُنہ کے قریب کیا۔ اُس کی سرگوشی
سنائی دی مگر صرف اتنی — "نا" — ہو سکتا ہے اُس نے "نہ" کہا ہو۔ یہ
بھی ممکن تھا کہ وہ قاتل کا نام بتا رہا تھا مگر "نا" کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ نام پورا
نہ بتا سکا۔ میں نے اُس کا آخری خرّاٹہ سُنا اور وہ مر گیا۔
میں نے اور راجیش نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہجوم بیٹھ

چکا تھا اور خاموش تھا۔ اچانک آواز سُنائی دی "وہ گیا... ارے کون ہے"۔۔۔ اس کے ساتھ ہی ہجوم میں پھر بھگدڑ مچ گئی۔ راجیش نے اپنی دبنگ آواز میں گرج کر کہا۔۔۔ "خاموش... بیٹھے رہو"

ہم نے ایک آدمی کو نیم کے درخت پر چڑھتے دیکھا۔ وہ پُرانا اور پھیلا ہُوا درخت تھا۔ ٹہن موٹے تھے اور وہ درخت دیوار کے قریب تھا۔ کچھ ٹہن دیوار کے اُوپر سے باہر کو گئے ہُوئے تھے۔ دیوار کی اُونچائی دس فٹ کے لگ بھگ تھی۔ ہم درخت سے اتنی دُور تو نہیں تھے مگر ہجوم میں سے گذر کر اُس آدمی تک پہنچنا جو ٹہن پر چلا گیا تھا، ممکن نہیں تھا۔ راجیش چلّایا "ارے پکڑو اسے"۔۔۔ مگر کسی نے اوپر جانے کی جرأت نہ کی۔ ہماری مجبوری یہ بھی کہ ہمارے پاس ریوالور نہیں تھے۔ میں اور راجیش مہمان آئے ہوئے تھے۔

میں اُس آدمی کی چال سمجھ گیا اور دروازے کی طرف دوڑا مگر بیٹھے ہوئے آدمیوں نے مجھے تیز نہ دوڑنے دیا۔ میں نے دروازہ کھولا، باہر نکلا اور اُس طرف گیا جدھر ٹہن جاتا تھا۔ اُدھر گلی تھی۔ باہر بھی لوگ جمع تھے اور میرے راستے میں رُکاوٹ بنے ہُوئے تھے۔ میں اُس گلی میں گیا۔ اُدھر اندھیرا تھا اور گلی خالی تھی۔ مجھے ایک آدمی دوڑتا سائے کی طرح دکھائی دیا اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ تعاقب بیکار تھا۔۔۔ قاتل نکل گیا۔

میں اندر چلا گیا اور اُس درخت کے پاس گیا جس پر وہ آدمی چڑھا اور ٹہن کے راستے دیوار پھلانگ گیا تھا۔ وہاں جو آدمی تھے، اُن سے پوچھا کہ وہ آدمی کہاں تھا اور کیسا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قریب ہی بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس

نے جوگیا رنگ کا پاجامہ اور اسی رنگ کا کُرتہ پہن رکھا تھا اور اُس نے سر پر میلے سے رنگ کی چادر لے رکھی تھی جس سے اُس کا سر ڈھانپا ہُوا تھا۔ وہ اچانک اُٹھا اور درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے درخت کا تنا دیکھا۔ اس پر تیزی سے چڑھنا مشکل نہیں تھا۔

”اُس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں؟“ ــــ میں نے پوچھا۔

صرف ایک آدمی نے یقین کے ساتھ بتایا کہ اُس کی مونچھیں گھنی اور لمبی تھیں، لیکن اُس کا چہرہ کوئی بھی بیان نہ کر سکا کیونکہ چادر ماتھے سے بھی نیچے آئی ہوئی تھی اور نیچے سے چادر نے ٹھوڑی بھی ڈھانپ رکھی تھی۔ یہ بھی کوئی نہ بتا سکا کہ اُس کے کپڑوں پر خون تھا یا نہیں۔ بہرحال یہ تصدیق ہو گئی کہ قاتل بڑی بڑی مونچھوں والا تھا۔ مقتول تحصیلدار کے اشارے کو میں صحیح سمجھا تھا۔

تین ٹارچیں چار کلہاڑیاں

سانپ نکل گیا تھا۔ اب ہمیں اس کی لکیر کا تعاقب کرنا تھا۔ میں نے یہ انتظام کرا دیا کہ ساتھ والی گلی میں کوئی نہ جائے۔ ہجوم حویلی کے سامنے تھا۔ میں ساتھ والی گلی میں کھُرے دیکھنا چاہتا تھا۔ کھوجی کے انتظار میں وقت ضائع ہو جانے کا خطرہ تھا۔ میں وہاں اجنبی تھا۔ راجیش سے کہا کہ وہ اس دوسرے قتل کی ابتدائی اور ضروری کاغذی کارروائی کر لے اور لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دے۔ اس سے پہلے اُسے یہ کام کرنا تھا کہ حویلی والے باغیچے

کے حصے کا دروازہ ذرا سا کھول کر اندر رکے ہوئے لوگوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالے اور سب کی جامہ تلاشی لے اور کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھے۔ رامیش ذہین اور قابل انسپکٹر تھا۔ اُسے کسی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ مجھے دو تین ٹارچوں اور تین چار آدمیوں کی ضرورت ہے جو لاٹھیوں یا کلہاڑیوں سے مسلح ہوں۔ میری یہ ضرورت فوراً پوری کر دی گئی۔ اُس زمانے میں ایک ایک فٹ لمبی ٹارچیں بھی ہوتی تھیں۔ مجھے تین ٹارچیں مل گئیں۔ تینوں بڑی تھیں۔ ایک اپنے ہاتھ میں اور ایک ایک دو آدمیوں کو دے دی۔ میرے ساتھ چار آدمی تھے۔ سب کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔

میں انہیں ساتھ لے کر اُس گلی میں گیا جس میں قاتل دیوار سے کُودا تھا۔ وہاں مٹی کچی، ور دھول تھی۔ کھُرے بڑے صاف تھے۔ یہ فلیٹ شوز کے جنہیں پی ٹی شوز بھی کہتے ہیں، نشان تھے۔ میں نے تلوے کے نشان سے پہچانا۔ اُس دَور میں ان کے تلوے ربڑ کے ہوتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس طرح اتنی تیزی سے درخت پر چڑھ گیا تھا۔ اگر جوتی چمڑے کے تلے والی ہوتی تو جوتی پہنے ہوئے وہ درخت پر نہ چڑھ سکتا۔ میں نے کبھی کھُرا نہیں اُٹھایا تھا یعنی میں نے پاؤں کے نشان دیکھ کر کبھی سراغ رسانی نہیں کی تھی۔ یہ ماہر کھوجیوں کا فن ہے جو مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔ میں نے کھوجیوں کو کھُرا اُٹھاتے دیکھ دیکھ کر کچھ سوجھ بوجھ حاصل کر لی تھی۔

فلیٹ شوز کا کھُرا دیکھ کر مجھے اطمینان ہُوا کہ کھُرا اُٹھا لوں گا۔ یہ آسان تھا۔

میں تین ٹارچوں کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ کھرے صاف تھے۔ یہ مجھے گاؤں سے باہر لے گئے۔ یہ حویلی گاؤں کے باہر تھی۔ آگے پگڈنڈی آگئی۔ اگر آپ نے دیہات کی پگڈنڈیاں دیکھی ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان پر کتنی دھول ہوتی ہے۔ قاتل بیس پچیس قدم پگڈنڈی پر چلتا رہا، پھر ساتھ والے کھیت میں داخل ہو گیا۔ میری خوش قسمتی کہ کھیت خالی تھا۔ یہاں مجھے کھرا تلاش کرتے کچھ دِقّت ہوئی لیکن میں بھٹکا نہیں۔

آگے سبزیوں والا باغ آگیا۔ یہ خاصا وسیع باغ تھا۔ میں نے آوازیں دیں "کوئی ہے؟ ... اوئے باہر نکلو"۔ بار بار پکارنے کے باوجود کوئی نہ آیا تو میں سمجھ گیا کہ باغ والے بھی تماشہ دیکھنے چلے گئے ہیں۔ باغ کے کیارے ہی کیارے تھے۔ بعض میں سبزیاں اُگی ہوئی تھیں اور بعض خالی تھے۔ کھرا بڑا صاف تھا۔ قاتل کیاروں میں سے گذرا تھا۔ میں تین ٹارچوں کی روشنی میں چار مسلح آدمیوں کے آگے آگے کھرا دیکھتا بڑھتا گیا۔ باغ سے نکلا تو کھیت آگئے۔ باغ اور کھیتوں کے درمیان گز بھر چوڑا راستہ تھا۔ اس پر بھی دھول اتنی کہ پاؤں کا نشان صاف نظر آتا تھا۔

گاڑی آئی اور گئی

یہاں کھرے دو ہو گئے۔ دوسرا کھرا ابھی نیلیٹ شوز کا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حویلی سے درخت کے ذریعے باہر آنے والے کا ایک

ساتھی یہاں کھڑا تھا۔ اب دونوں پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ مجھے ایک خیال آیا۔ قاتل ایک تھا یا دو، وہ اس جرم کے اُستاد تھے، لیکن وہ دیہاتی نہیں تھے۔ اگر وہ دیہات کے رہنے والے پیشہ ور قاتل ہوتے تو اپنے کھُروں کے متعلق لاپروا نہ ہوتے۔ ہر دیہاتی جانتا ہے کہ واردات ہوتی ہے اور کھوجی کھُرا اٹھاتا ہے۔ استاد تو پوری طرح محتاط ہوتے تھے۔ وہ کنکریوں والے راستوں پر چلتے تھے۔ کھوجیوں کو گمراہ کرنے کے لیے ندیوں میں اُتر جاتے اور دُور جا نکلتے تھے۔ اگر زیادہ ہوں تو قطار میں چلتے تھے تاکہ ایک دوسرے کے کھُرے پاؤں تلے مٹتے جائیں۔

یہ قاتل شہر کے معلوم ہوتے تھے۔ شہروں میں مجرموں کے کھُرے نہیں ملا کرتے۔ مکان پکے، سڑکیں اور فٹ پاتھیں بھی پکی ہوتی ہیں۔ شہروں میں انگلیوں کے نشان دیکھے جاتے ہیں لیکن جو مدد پاؤں کے نشان کر سکتے ہیں وہ انگلیوں کے نشان نہیں کر سکتے۔ یہ مجرم شہری ہو سکتے تھے جو کچے راستوں اور نرم نرم کیاروں پر چلتے رہے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ دیہات کی زمین مجرم کو پکڑ لیا کرتی ہے۔ اُن کے شہری ہونے کا ایک اور ثبوت یہ ذہن میں آتا تھا کہ شہری گانے والی کے ساتھ کسی دیہاتی کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ قمر بائی کے قتل کا باعث رقابت تھا یا کوئی عداوت۔ قاتل شہری ہی ہو سکتے تھے۔ البتہ تحصیلدار کا قتل ذہن میں کچھ پیچیدگی پیدا کر رہا تھا۔

میں یہی کچھ سوچتا اور کھُرے دیکھتا بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے ریل گاڑی کی آواز سُنائی دی جو دُور تھی، پھر انجن کی وِسل سنائی دی۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ دُور سے

انجن کی روشنی نظر آئی۔ میں گاؤں سے تقریباً ایک میل دُور آ گیا تھا۔ وہاں سے ریلوے سٹیشن تقریباً پون میل دُور تھا۔ کھروں کا رُخ اُدھر ہی تھا۔ میں نے اپنے ساتھ کے دو آدمیوں سے پوچھا کہ ریلوے سٹیشن کو اور کوئی راستہ جاتا ہے؟ — انہوں نے بتایا کہ گاؤں سے ایک کچا راستہ نکلتا ہے وہ سیدھا ریلوے سٹیشن تک جاتا ہے۔ وہ چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک مسافر گاڑی دن کو یہاں رُکتی ہے اور ایک رات کو۔

پولیس کی چھٹی حس نے مجھے بتایا کہ دونوں مجرم ریلوے سٹیشن پہنچ گئے ہیں اور اس گاڑی سے چلے جائیں گے۔ میرے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ میں اتنی تیز بھی نہیں دوڑ سکتا تھا۔ گاڑی ریلوے سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے وہاں سے کھرا اٹھانا ترک کر دیا اور بہت تیز ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ گاؤں سے آنے والا راستہ آ گیا۔ یہ کچی پگڈنڈی تھی۔ میں نے رُک کر ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ بڑے صاف کھرے نظر آ گئے۔ میں اور تیز چل پڑا۔ گاڑی رُکی اور انجن وسلیں دینے لگا پھر گاڑی چل پڑی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ قاتل نکل گئے ہیں۔

قاتل بغیر ٹکٹ گئے

میں جب ریلوے سٹیشن پہنچا تو گاڑی دُور جا چکی تھی۔ سٹیشن ماسٹر اپنے کوارٹر کو جا رہا تھا۔ اُسے روکا اور اُس کے دفتر لے گیا۔ ٹکٹ کلرک کو بلایا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور اُسے بتایا کہ ایک گانے والی اور ایک تحصیلدار قتل

ہو گئے ہیں۔ سٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ وہ بھی وہاں مدعو تھا لیکن اُس کا ایک افسر گذر رہا تھا اس لیے نہ جا سکا۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے اُس کے تعاون کی ضرورت ہے۔ بکنگ کلرک سے پوچھا کہ کتنے آدمیوں نے ٹکٹ لیے تھے۔ اُس نے کہا کہ چار ٹکٹ فروخت ہوئے ہیں۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ ان چاروں کے حلیئے اور چہرے اُسے یاد ہیں؟ اُس نے جواب دیا کہ چہرے دیکھنا اور یاد رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ سوچنے لگا پھر کہنے لگا کہ تین مرد تھے جو بالکل دیہاتی تھے اور ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔

"ان میں سے کسی کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں؟" — میں نے پوچھا "سر پر چادر اور اُس کے کپڑے جوگیا رنگ کے ہوں گے۔"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اتنی بڑی بڑی مونچھوں والا کوئی نہیں تھا اور کسی کے سر پر چادر بھی نہیں تھی۔"

کانٹے بدلنے والا ایک ملازم وہاں کھڑا تھا۔ اُس نے کہا — "میں نے دو آدمیوں کو چلتی گاڑی پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ میں ڈرائیور کو گولہ (ٹوکن) دینے گیا تو گاڑی چلنے کا وقت ہو گیا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ گاڑی چل پڑی تو ایک طرف سے، پلیٹ فارم کے باہر سے، دو آدمی دوڑے آئے اور دونوں پہلے ڈبے کے پہلے کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گئے۔ انہوں نے یقیناً ٹکٹ نہیں لیے تھے۔"

"ان میں سے ایک کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں؟" — میں نے پوچھا — "تم نے غور سے تو نہیں دیکھا ہو گا۔"

"دونوں نے سروں پر اس طرح چادریں لے رکھی تھیں کہ ان کے چہرے اچھی

طرح نظر نہیں آتے تھے"۔ اُس نے جواب دیا۔ "وہاں روشنی کم تھی۔۔۔۔ آپ بابو صاحب سے جوگیا کپڑوں کا پوچھ رہے تھے۔ مجھے ایسے خیال آتا ہے جیسے ایک کے کپڑے جوگیا رنگ کے تھے۔"

یہ تھے میرے مجرم۔ انہوں نے ٹکٹ نہیں لیے تھے۔ وہ گاڑی کے وقت سے پہلے سٹیشن تک پہنچ گئے ہوں گے لیکن پلیٹ فارم سے باہر انجن کی طرف کہیں رُکے رہے۔ گاڑی چلی تو دوڑ کر سوار ہو گئے۔

میں نے سٹیشن ماسٹر سے پوچھا کہ اس وقت گاڑی کہاں ہو گی۔ ان سے باتیں کرتے پون گھنٹہ گذر گیا تھا۔ سٹیشن ماسٹر نے پچیس میل دور کے ایک سٹیشن کا نام لیا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اُس سٹیشن ماسٹر کو فون کرے اور کہے کہ گاڑی کو وہیں روکے رکھے۔ سٹیشن ماسٹر ہچکچایا۔ میں نے اُسے کہا کہ دو انسان قتل ہو گئے ہیں اور قاتل اس گاڑی میں فرار ہو رہے ہیں۔ میں پولیس آفیسر ہوں۔ اگر گاڑی نہ روکی گئی اور قاتل نکل گئے تو سٹیشن ماسٹر جواب دہ ہو گا کہ اُس نے گاڑی روکنے کا انتظام کیوں نہیں کیا۔

سٹیشن ماسٹر نے وہ سٹیشن ملا دیا اور وہاں کے سٹیشن ماسٹر کو میرے متعلق بتا کر فون مجھے دے دیا۔ پتہ چلا کہ وہ سٹیشن ماسٹر مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور میرے طریقہ تفتیش سے بھی واقف ہے۔ اُس نے بتایا کہ گاڑی اُس کے سٹیشن میں داخل ہو رہی ہے اور وہ اُسے روکے رکھے گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں لاری پر آرہا ہوں۔ میں نے اُسے یہ تسلی بھی دی کہ میں اُسے تحریر دے دوں گا کہ میں نے گاڑی رکوائی تھی اور اگر وہ کہے گا تو میں اُس کے اعلیٰ حکام کو بھی مطمئن

کر دوں گا۔

اس کے علاوہ میں نے سٹیشن ماسٹر سے کہا کہ وہ اگلے ڈبے کے پہلے کمپارٹمنٹ پر نظر رکھے۔ وہاں جوگیا رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے، بڑی مونچھوں والا ایک آدمی ہوگا۔ اُس کے کپڑوں پر خون کے دھبے بھی ہوں گے۔ اگر یہ آدمی گاڑی سے اُترے تو اُسے پکڑنے کی کوشش کرے اور بہتر یہ ہے کہ وہ تھانے سے پولیس کی مدد لے لے۔

قاتل تیز اور ذہین نکلے

ریلوے سٹیشن سے مجھے سائیکل مل گئی۔ میں اس پر سوار ہُوا اور شادی والی حویلی پہنچا۔ راجیش لاشیں اُٹھوا کر تھانے لے گیا تھا۔ انہیں پوسٹ مارٹم کے لیے پندرہ میل دُور جانا تھا۔ میں نے بارات والی بسوں میں سے ایک بس لی۔ دو آدمی ساتھ لیے اور اُس سٹیشن کو روانہ ہوگیا جہاں مسافر گاڑی رُکی ہوئی تھی۔ راجیش کا تھانہ وہاں سے چند میل دُور راستے میں تھا۔ وہاں ذرا سا رُک کر اُسے بتایا کہ میں کیا کچھ کر آیا ہوں اور اب کہاں جا رہا ہوں۔ اُس کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ چلتے چلتے اُس نے دو کانسٹیبل میرے ساتھ روانہ کر دیے۔

میرے کہنے پر ڈرائیور نے بس بہت تیز چلائی۔ سڑک خالی تھی بس نے پچیس میل کا فاصلہ بیس منٹ میں طے کر لیا۔ میں سیدھا ریلوے سٹیشن گیا۔

گاڑی رُکی کھڑی تھی۔ سٹیشن ماسٹر نے تھانے سے مدد منگوالی تھی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل چار کانسٹیبلوں کے ساتھ آگیا تھا۔ یہاں میں ایک بات کہوں گا۔ پولیس اگر دیانت داری سے مجرموں کو پکڑنے کی کوشش کرے تو جرائم نوّے فیصد ختم ہو سکتے ہیں۔ یہاں تو بعض کیسوں میں دو تھانیداروں کے درمیان یہ تنازعہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ یہ کیس کس تھانے کا ہے۔ ایسے تنازعے میں یوں بھی ہوتا ہے کہ مضروب زخموں کی تاب نہ لا کر مر جاتا ہے اور اُس کا نزعی بیان بھی کوئی نہیں لیتا۔ اس سے مجرم اگر پکڑے بھی جائیں تو استغاثہ کمزور ہونے کی وجہ سے بری ہو جاتے ہیں۔

اس تھانے نے سٹیشن ماسٹر کی اطلاع پر پولیس سٹیشن پر بھیج دی۔ خود میرا یہ حال تھا کہ یہ میرا کیس نہیں تھا لیکن میں تعاقب میں ہلکان ہُوا جا رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ قاتل پولیس سے زیادہ تیز اور ذہین نکلے۔ وہ اس طرح کہ میں گاڑی کے پہلے کمپارٹمنٹ میں گیا۔ مسافر زیادہ نہیں تھے۔ سب کو دیکھا۔ مونچھیں تو کئی ایک کی تھیں مگر جوگیا کپڑے کسی کے نہیں تھے۔ باوردی پولیس میرے ساتھ تھی۔ مسافر ڈر گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ فلاں سٹیشن سے دو مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوئے تھے، وہ کون ہیں؟

ایک نے بتایا اور تین چار نے اُس کی تائید کی کہ وہ دروازے میں کھڑے رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ایک نے جوگیا پاجامہ اور اسی رنگ کا کُرتہ پہن رکھا تھا۔ دوسرے کا پاجامہ کُرتہ سلیٹی تھا۔ جوگیا کپڑوں والے کی مونچھیں گھنی اور مروڑی ہوئی تھیں۔ دونوں نے گہرے سلیٹی رنگ کی قیمتی چادریں لے

رکھی تھیں۔

میں نے اور زیادہ کریدا تو ایک مسافر نے بتایا کہ دونوں نے فلیٹ شوز پہن رکھے تھے۔ صرف ایک مسافر نے میرے اس سوال کا جواب دیا کہ اُن کے کپڑوں پر سُرخ داغ یا چھینٹے تھے یا نہیں۔ اُس نے کہا کہ سلیٹی کپڑوں والے کے پاجامے پر کچھ سُرخ دھبّے نظر آتے تھے۔ اُن کے کُرتے چادروں میں ڈھکے ہوئے تھے۔

وہ گئے کہاں؟

مسافروں نے بتایا کہ گاڑی اس سٹیشن پر رُکی تو رُکی ہی رہی۔ وہ دونوں دروازے میں سے باہر دیکھتے رہے۔ یہاں گاڑی دو منٹ سے زیادہ نہیں رُکتی مگر پندرہ بیس منٹ گذر گئے۔ ان دونوں میں سے ایک جس نے سلیٹی کپڑے پہن رکھے تھے اُتر گیا۔ دوسرا دوسری طرف والے دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ جو گیا کپڑوں والا تھا سلیٹی کپڑوں والے نے پائیدان پر کھڑے ہو کر اپنے ساتھی کو آواز دی۔ "نادر!" نادر نے اُس کی طرف دیکھا تو شاید انہوں نے ایک دوسرے کو اشارے کیے۔ نادر وہیں کھڑا رہا۔ اُس کا ساتھی اُس کے پاس آگیا اور دونوں اس طرف اُتر گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں، ہیڈ کانسٹیبل اور چھ کانسٹیبلوں کے ساتھ پہنچ گیا۔

میں نے پلیٹ فارم کے دوسری طرف دیکھا جدھر وہ اُتر گئے تھے! اُدھر اندھیرا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ تین آدمی اُدھر گاڑی کی لمبائی تک پھیلا دے۔ اُسے ان کے ساتھ اس حکم سے بھیج دیا کہ کوئی آدمی گاڑی سے اُتر کر بھاگنے کی کوشش کرے تو اُسے پکڑے اور اگر وہ نہ رُکے تو اُس کی ٹانگوں

پر گولی چلا دے۔

میں نے تین کانسٹیبلوں کو پلیٹ فارم پر پھیلا دیا۔ خود یوں کیا کہ اس کمپارٹمنٹ کے دو مسافروں کو جو مجرموں کو پہچانتے تھے، ساتھ لیا اور گاڑی کے تمام ڈبوں میں گھوم گیا۔ ہر ایک مسافر کو دیکھا، مگر جوگیا اور سلیٹی کپڑوں والے نہ ملے۔ یہ میں نے محض ایک کارروائی پوری کی تھی۔ توقع یہی تھی کہ وہ نکل گئے ہیں۔ اس کارروائی کے بعد میں نے سٹیشن ماسٹر اور گاڑی کے گارڈ کو ان کی ضرورت کے مطابق تحریر دے دی۔ میں سمجھ گیا کہ دونوں قاتل ہوشیار تھے۔ گاڑی کو رُکے زیادہ وقت ہو گیا تو وہ چوکس ہو گئے۔ انہوں نے ہیڈ کانسٹیبل کو کانسٹیبلوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر دیکھ لیا ہوگا۔ انہیں دیکھتے ہی کھسک گئے۔

اس کارروائی کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میرے پاس سوچنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔ میں تعاقب میں تھا اور ساتھ ساتھ سوچ بھی رہا تھا۔ مجھے گاڑی رکوانی نہیں چاہیے تھی۔ بس میرے پاس تھی جو گاڑی کی رفتار سے دُگنی رفتار پر چل سکتی تھی۔ میں اگلے سٹیشن پر چلا جاتا اور گاڑی رُکتے ہی قاتلوں کے کمپارٹمنٹ میں جا دھمکتا۔ انہیں بھاگ نکلنے کا موقع نہ ملتا۔ بہر حال یہ یقین ہو گیا کہ قاتل یہی دو ہیں۔ ان کا کچھ حلیہ اور نشانیاں بھی معلوم ہو گئیں۔

میں بس میں بیٹھا اور واپس راجیش کے تھانے میں چلا گیا۔

طوائفوں اور ناچنے گانے والیوں کی دُنیا

راجیش تمام تر کاغذی کارروائی مکمل کر چکا تھا۔ لاشیں پوسٹ مارٹم کے

لیے چلی گئی تھیں۔ قمر بائی کی نائکہ اور اُس کے سازندے لڑکی والوں کے گھر میں تھے۔ راجیش نے مجھے بتایا کہ وہ اُن سے وہیں جاکر پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے مجھ سے درخواست کے لہجے میں کہا، میں اتفاق سے وہیں ہوں اور اُس کے ساتھ رہوں میں رات تک تو رُک سکتا تھا، اگلے دن رکنا میرے بس سے باہر تھا تاہم میں نے اُس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور ہم دونوں لڑکی والوں کے گھر چلے گئے۔

طوائفوں اور ناچنے گانے والیوں کی اپنی دُنیا ہوتی ہے۔ اُن کے طور طریقے الگ، سیاست الگ، اُن کی چاہت الگ اور اُن کے تعصّبات اور عداوتیں الگ ہوتی ہیں۔ وہاں دوستی اور دشمنی کا تصوّر کچھ اور ہوتا ہے۔ وہاں جسم اور ناز و انداز کا کاروبار ہوتا ہے اور محبت صرف پیسے سے ہوتی ہے۔ اِس دنیا میں کوئی واردات ہو جائے تو سُراغ لگانا مشکل نہیں ہوتا۔ پولیس والے عموماً کی اس منڈی کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

قمر بائی گانے والی خوبصورت عورت تھی بلکہ میں اسے لڑکی کہوں گا۔ اُس کے چاہنے والے کئی ہوں گے اور اُن سب میں رقابت لازمی تھی۔ قمر بائی اور تحصیلدار کا قتل رقابت کا ہی نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ قمر بائی کے چاہنے والے کون کون تھے۔ گانا سننے کے لیے تو اُس کے کوٹھے پر بے شمار لوگ جاتے ہوں گے لیکن چند ایسے اُلّو کے پٹھے بھی ہوتے ہیں جو گانے والیوں کو دل دے بیٹھتے ہیں اور اُن کے اس جھانسے میں آ جاتے ہیں کہ وہ بھی انہیں دل و جان سے چاہتی ہیں۔

لڑکی کے جاگیردار باپ کے گھر گئے۔ وہاں تو دولت لُٹ رہی تھی او

دُور دُور سے تماشائی آئے ہوئے تھے۔ وہاں بارات بھی اُتری ہوئی تھی مگر اب وہاں اُتو بول رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں ایسے لگتا تھا جیسے یہ محل جیسی حویلی آسیب زدہ ہوگئی ہو۔ رات آدھی سے زیادہ گذر گئی تھی۔ وہاں چند ایک آدمی جو اس حویلی کے ملازم اور مکین تھے اور باراتی موجود تھے لیکن ایسی خاموشی جیسے وہاں کوئی بھی نہ ہو۔

لڑکی کے باپ اور لڑکے کے باپ نے مجھے کہا کہ میں تفتیش اپنے ہاتھ میں رکھوں۔ لڑکے کا باپ مجھے وہیں رکھنے پر زیادہ اصرار کر رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اپنے آپ ہی دوسرے تھانے کے کیسوں میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ میں اپنے تھانے سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بتایا نہیں جا سکتا تھا کہ تفتیش کتنے دنوں یا کتنے مہینوں میں ختم ہوگی۔ دولہا کے باپ نے کہا کہ وہ مجھے ایس۔ پی سے احکام لے دے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان دونوں باپوں کا انگریز افسروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے اور یہ خوشامدی لوگ ہیں۔ انگریز افسروں سے اتنا سا حکم لے سکتے ہیں کہ فلاں کیس کی تفتیش میں فلاں سب انسپکٹر کو بھی لگا دیا جائے۔

قمر بائی طوائف نہیں تھی

تحصیلدار چالیس سال کا خوبرو مسلمان تھا۔ اُن دنوں دلّی میں ہوتا تھا۔ بالائی آمدنی کے علاوہ بہت سی زرخیز اراضی کا مالک بھی تھا۔ میرا اور راجیش کا خیال تھا کہ تحصیلدار کو اُس کے کسی رقیب نے قتل کرایا ہے۔ دونوں کا اکٹھا قتل بتاتا

تھا کہ ان دونوں کا آپس میں تعلق تھا۔ میں ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ قمر بائی کسی اور وجہ سے قتل ہوئی اور تحصیلدار کے قتل کا باعث کچھ اور تھا اور یہ کہ دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔

ہم نے قمر بائی کے سازندوں اور نائکہ کو اکٹھے ہی الگ بٹھا لیا۔ یہ طریقہ صحیح نہیں تھا۔ ان سے الگ الگ پوچھ گچھ ہونی چاہیئے تھی لیکن راجیش کہتا تھا کہ اکٹھے بٹھانا فائدہ مند رہے گا۔ میں مان گیا۔ قمر بائی کے سازندے تین تھے اور ایک نائکہ۔

ہم دونوں نے پہلے تو انہیں خوب ڈرایا اور یہ بھی کہا کہ ہم ان چاروں کو مشتبہ سمجھ لیں گے اور قاتل ان ہی میں سے کوئی ہوگا۔

"تمہیں کھلی اجازت ہے کہ جھوٹ بولو"۔ میں نے اُن سے کہا۔ "ہم تمہیں نہیں روکیں گے لیکن تم پولیس کو اچھی طرح سمجھتے ہو۔ ہم دِلّی جا رہے ہیں۔ تمہارے اندر کی ہر بات ہمیں مخبروں سے اور تمہارے ارد گرد رہنے والے دوسرے کنجروں سے معلوم ہو جائے گی، پھر میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ پولیس کو جھوٹی باتیں بتانے کے جرم میں دو دو سال کے لیے اندر کرا دوں گا۔"

چاروں اکٹھے ہی بولنے لگے۔ وہ منت سماجت کے لہجے میں ہمیں یقین دلا رہے تھے کہ وہ سچ بولیں گے۔ راجیش نے انہیں کہا کہ اُن کی بائی مر چکی ہے اور وہ بے روزگار ہو چکے ہیں۔ انہیں اب سچ بولنے سے نہیں ڈرنا چاہیئے بلکہ جھوٹ بولنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیئے۔

"تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری بائی کو کس نے قتل کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم کسی کا بھی نام نہیں لے سکتے"۔ ایک نے کہا۔ "ہمیں کسی پر

شک نہیں۔"

"تحصیلدار کا قمر بائی کے ساتھ کیا تعلق تھا؟"

"وہ ہمارا پکا گاہک تھا"۔ ہمیں جواب ملا۔ "قمر پر تو وہ جان نثار کرتا تھا۔"

"نادر کون ہے؟"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گئے۔

"اُس کی مونچھیں گھنی اور مروڑی ہوئی رہتی ہیں"۔ میں نے کہا۔ "کبھی کبھی جوگیا رنگ کا کرتہ اور پاجامہ پہنتا ہے۔"

"اوہ نادر"۔ ایک سازندے نے کہا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ارے وہ نادر... وہ حوض قاضی والا"۔ آدر ہم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "وہ حضور! داداگری کرتا ہے۔ نامی دادا (بدمعاش) ہے۔"

"تمہارے ہاں آتا تھا؟"۔ راجیش نے پوچھا۔ "قمر بائی کے ساتھ اُس کا تعلق تھا یا کبھی رہا ہے؟"

"نہ جی"۔ ہمیں جواب ملا۔ "ایک دو مرتبہ آیا ہوگا۔ بائی کا اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا ہم صرف گانے کا کاروبار کرتے تھے قمر بائی طوائف نہیں تھی۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نادر کے ساتھ تمہاری نہ دوستی تھی نہ دشمنی۔"

"کچھ بھی نہیں جی"۔ اُنہوں نے کہا۔ "کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔"

مقتولہ مردوں کی کمزوریوں کو سمجھتی تھی

"تمہارے ہاں گانا سننے والے تو بہت آتے تھے"۔ میں نے کہا۔

"خاص گاہک کون کون سے تھے؟ یعنی جو تمہاری بائی کی محبت کا دم بھرتے اور دولت لٹاتے تھے؟"

معلوم نہیں سازندوں۔ نے بوڑھی نائکہ کی طرف کیوں دیکھا۔ وہ شاید اُسے قمر بائی کا رازداں سمجھتے تھے۔۔

"ایک تو تحصیلدار صاحب تھے جو قتل ہو گئے ہیں"۔ نائکہ نے جواب دیا۔ "یہ تو صحیح معنوں میں قمر بائی پر جان نثار کرتے تھے۔ کپڑے وہ لا کے دیتے تھے جو صرف رانیاں اور راجکماریاں پہنتی ہوں گی۔ دوسرے نمبر پر اس دولہا کے والد صاحب تھے جو مہینے میں دو تین بار دلّی آتے اور دن قمر بائی کے ساتھ گذارتے تھے۔ گانا سُنتے تھے اور الگ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ یہ صاحب دو پھیروں میں اتنا دے جاتے تھے جو عام تماش بین پورا مہینہ آتے تو بھی نہیں دے سکتے تھے۔ تیسرے نمبر پر اسی باپ کا یہ بیٹا تھا جو آج یہاں دولہا بن کے آیا ہے۔ یہ تو شہزادہ ہے۔ جب بھی آتا تھا ضد کرتا تھا کہ قمر کو سیر کے لیے لے جاؤں گا لیکن ہم نے لڑکی کو کبھی بھی اس کے ساتھ جانے نہیں دیا تھا۔ ہمارا کاروبار گانے تک محدود ہے۔ ہم بیاہ شادیوں پر بائی کو لے جاتے رہے ہیں جہاں ہم چاروں اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ کسی کے ساتھ اکیلے کبھی نہیں جانے دیا۔ چوتھے نمبر پر ایک ہندو ٹھیکیدار تھا جو قمر بائی پر فریفتہ تھا۔"

"قمر ان میں سے کسے چاہتی اور کسے ناپسند کرتی تھی؟"

"آپ بھولے بادشاہ ہیں"۔ ایک سازندے نے اُداس سی مُسکراہٹ سے کہا۔ "ہم لوگ اور ہماری بائیاں صرف پیسے کو چاہتی ہیں۔ قمر بائی ہوشیار

تھی۔ اپنے پیشے کو اور مردوں کی کمزوریوں کو خوب سمجھتی تھی۔ محبت کا اظہار کرنے والوں کو اُس نے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ لیلیٰ مجنوں کا ڈرامہ کھیلنا جانتی تھی۔ وہ چاہنے والوں کو مجنوں بنائے رکھتی تھی۔ جو زیادہ مچل جاتا اور غلط ضد کرنے لگتا، اُسے وہ شراب پلا پلا کر بے ہوش کر دیتی تھی۔"

"ذرا غور کریں حضور!" — دوسرے سازندے نے کہا۔ "باپ بیٹا ایک ہی لڑکی پر فدا تھے اور وہ لڑکی محض کاروباری تھی۔ یوں کہیے کہ باپ بیٹا ایک دھوکے سے دل بہلا رہے تھے۔"

"تمہارے ہاں اور کون آتا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

میں نے دراصل کچھ اور پوچھا مگر نائکہ کچھ اور سمجھی۔ کہنے لگی — "ہمارے ہاں کون نہیں آتا۔ جیل سے نکل کے جو آتے ہیں وہ بھی ہمارے ہاں آتے ہیں اور ہم نے انہیں بھی اپنے ہاں دیکھا ہے جو حج کر کے آئے تھے۔ ہماری دُنیا ننگی ہے حضور! انسان ہمارے کوٹھوں پر ہی آ کر ننگا ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کی اصلیت دیکھنی ہو تو ہمارے ہاں آ کر دیکھیں۔"

میرا جی چاہ رہا تھا کہ ان سے ایسی ہی باتیں پوچھوں لیکن یہ قتل کی واردات کی تفتیش تھی۔ مجھے اسی دائرے میں رہنا تھا۔

یہ رنڈی تمہاری ماں تو نہیں

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ قمر بائی کے ان چار چاہنے والوں میں آپس

ہیں عداوت کس کس کی تھی۔ میں نے ان سازندوں اور نائکہ پر بہت سوال پھینکے۔ اُن کے جوابوں میں سے سوال نکالے۔ جرح کی۔ راجیش بھی سوال پوچھتا اور جرح کرتا رہا۔ اتنی زیادہ مغز کھپائی سے یہ حاصل ہوا کہ تحصیلدار (مقتول) اور دولہا کے درمیان چپقلش پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ دونوں قمر کو بڑھ چڑھ کر تحفے دیتے تھے۔

نائکہ نے دولہا کے متعلق بتایا کہ وہ قمر بائی سے کہا کرتا تھا کہ تحصیلدار کے ساتھ بے رُخی سے پیش آیا کرو۔ قمر نے اُسے کہا تھا کہ وہ اپنا کاروبار خراب نہیں کرنا چاہتی۔ نائکہ نے بتایا کہ اس شادی سے کوئی ایک ماہ پہلے یہ دولہا دِلی گیا اور قمر بائی کے ہاں چلا گیا۔ دن کا وقت تھا۔ تحصیلدار کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اس نوجوان کا باپ بھی قمر بائی کا شیدائی ہے۔ اس نوجوان نے تحصیلدار کے ساتھ گستاخی سے بات کی۔ تحصیلدار نے اُسے کہا کہ وہ یہاں سے نکل جائے۔ دولہا طیش میں آگیا۔ اُس نے قمر کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔ اس پر قمر کو غصہ آگیا۔ اُس نے تحصیلدار سے کہا کہ یہ فلاں جاگیردار کا بیٹا ہے جو یہاں آیا کرتا ہے۔

تحصیلدار اس کے باپ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس نے دولہا سے کہا کہ وہ فوراً باہر چلا جائے ورنہ وہ اُس کے باپ کو بتا دے گا۔ ترش کلامی میں تحصیلدار نے کہہ دیا — "جیسا باپ ویسا بیٹا"۔

دولہا نے غصے سے گرجتے ہوئے کہا — "یہ رنڈی تمہاری ماں تو نہیں"۔

تحصیلدار بھڑک اُٹھا مگر قمر بائی غصے سے بولی — اُس نے دولہا سے کہا — "میں رنڈی نہیں ہوں، میں گاتی ہوں۔ تم نے مجھ میں رنڈیوں (طوائفوں) والی کون سی بات دیکھی ہے؟"

قمر بائی تحصیلدار کی طرفدار ہو گئی۔ سازندوں نے بتایا کہ چونکہ وہ تحصیلدار تھا، حاکم تھا اس لیے وہ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ قمر بائی نے اچھا کیا کہ تحصیلدار کو ناراض نہ کیا۔ دولہا میاں چلے گئے لیکن جاتے جاتے قمر کو یہ دھمکی دے گئے کہ تمہارے منہ پر تیزاب نہ پھینکا تو میں بے غیرت ہوں گا۔

اس انکشاف سے یہ شک قدرتی تھا کہ قمر بائی اور تحصیلدار کو دولہا نے قتل کرایا ہے۔ قتل کا یہ موقعہ موزوں تھا۔ جاگیرداروں اور ان کے "راجکماروں" کے لیے کسی کو قتل کرانا مشکل نہیں تھا۔ کرائے کے پیشہ ور قاتل مل جاتے تھے۔ آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ اس دولہا کو میں جانتا تھا۔ اوباش، عیاش، خود سر اور لڑاکا تھا۔ وہ آج کل کی پنجابی پکچروں کے ہیرو اور دلہن کی طرح بڑھکیں مارنے والا آدمی تھا۔

جاگیر۔ ایمان کا سودا

راجیش سازندوں اور نائکہ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا اور میں اپنے ہی ایک خیال میں اُلجھ کر اس سے لاتعلق ہو گیا۔ اپنے متعلق آپ کو پہلے بھی کبھی بتا چکا ہوں کہ کٹی پھٹی ہوئی، چیری پھاڑی ہوئی اور گلی سڑی لاشیں دیکھ دیکھ کر اور قاتلوں، ڈاکوؤں اور عجیب و غریب ابنارمل آدمیوں اور عورتوں سے پوچھ گچھ کر کر کے پولیس آفیسر انسانی جذبات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ دل پتھر بن جاتے ہیں اور ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کہ جذبات کو مار دیا جائے۔ اگر ایک حسین و جمیل جوان بیوی اپنے بوڑھے اور عیاش

خاوند کو زہر دے کر مار ڈالے اور تھانیدار جذبات کے جال میں آجائے کہ یہ جوان لڑکی قتل پر مجبور ہو گئی تھی اور یہ مظلوم ہے تو تھانے اور حوالاتیں دارالامان بن جائیں کوئی قاتل سزا نہ پا سکے۔

مجھ میں یہ خامی تھی کہ میں اپنے جذبات کو نہ مار سکا۔ قانون کو میں نے جذبات پر کبھی قربان نہیں کیا تھا، سوائے دو تین کیسوں کے لیکن اکثر کیسوں میں میرے جذبات اُبل پڑتے تھے اور میں اپنا خون پینے لگتا تھا۔ یہی حال میرا یہاں ہوا۔ اگر اس گانے والی کو اور تحصیلدار کو دولہا نے ہی قتل کرایا تھا تو میں اور راجپتیں اسے لاکھوں روپوں کی رشوت کے عوض بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے مگر مجھے خیال یہ آ کے بے چین کرنے لگا کہ دولہا شادی کے چوبیس گھنٹے بعد ہی حوالات کا مہمان ہو گا۔ یہ ڈولی نہیں لے جا سکے گا اور اس کی ازدواجی زندگی کی ابتدا حوالات سے ہو گی اور شاید پھانسی کے تختے پر جا ختم ہو یا یہ اُس وقت قانون اور سزا کی گرفت سے نکلے گا جب اس کی جوانی ڈھل چکی ہو گی۔

یہ انگریزوں کی عطا کی ہوئی جاگیر کا قصور تھا... انگریزوں نے یہ جاگیر اس کے دادا پردادا کو اپنی قوم سے غداری کے صلے میں دی تھی جب ہندوستان میں مجاہدین آزادی کی لاشیں درختوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں اور ان کے لیڈروں کو عمر بھر کے لیے کالا پانی بھیجا جا رہا تھا۔ اُس وقت دولہا کے دادا پردادا انگریزوں سے اشرفیوں کی تھیلیاں اور جاگیریں وصول کر رہے تھے۔ انہی کی نشاندہیوں پر بے شمار مجاہدین پکڑے گئے اور فرنگیوں کی اذیتوں اور بربریت کا نشانہ بنے تھے۔

اب یہ جاگیر اور ایمان کا یہ سودا رنگ دکھا رہا تھا۔ باپ بیٹا ایک ہی آبرو باختہ

مغنیہ کے جنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں اخلاق اور کردار کا نام و نشان نہ تھا۔ بیٹا قتل کے الزام میں پکڑا جانے والا تھا۔ اگر وہ قتل کرانے کا مجرم نہیں تھا تو بھی یہ صورت کتنی شرمناک تھی کہ باپ بیٹا ایک ہی کشتی میں سوار تھے اور یہ کشتی گناہوں کے دریا میں تیر رہی تھی۔ میں آپ کو اپنی تفتیش کی کہانیاں صرف تفریح طبع کے لیے نہیں سنایا کرتا۔ آپ غور سے میری کہانیاں پڑھیں تو آپ کو ان میں نیکی اور بدی اور جزا اور سزا کا فلسفہ ملے گا اور کچھ عبرت ملے گی اور یہ بھی کہ جس مجرم کو سزا دُنیا کا قانون نہیں دے سکتا، اُسے خدا کا قانون ضرور پکڑتا ہے اور کسی نہ کسی رنگ میں سزا دیتا ہے۔

"سُنا ملک صاحب!" راجیش نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میں نے نہیں سُنا تھا۔ سُنا تو ہوگا لیکن میرا دھیان اپنے خیالوں میں اُلجھ گیا تھا۔

"ایک صورت اور سامنے آرہی ہے" — راجیش نے کہا — "یہ بھی سُن لو"۔

"پھر سُناؤ یار!" — میں نے قدرے اکتائے لہجے میں کہا — "ہم بائی کا مُجرا دیکھنے آئے تھے اور وہ قتل ہوگئی"۔

"اب دوسری بائی کا مُجرا سُنو" — راجیش نے کہا۔

ابلیس کی منڈی میں

راجیش سازندوں سے کچھ نہ کچھ پوچھتا رہا۔ پتہ چلا کہ قمر بائی کی دشمنی ایک

اور گانے والی کے ساتھ تھی جس کا نام کیرتن کماری تھا۔ یہ بات اس طرح سامنے آئی کہ راجیش نے اُن سے پوچھا تھا کہ دلہن کے باپ نے یہاں بلانے کے لیے قمر بائی کا انتخاب کس طرح کیا تھا۔ کیا یہ بھی اُس کے چاہنے والوں میں سے تھا یا کسی اور نے قمر بائی کی سفارش کی تھی؟

سازندوں اور نائکہ نے بتایا کہ دلہن کا باپ اُن کے ہاں کبھی نہیں گیا تھا۔ قمر بائی کا انتخاب دولہا کے باپ اور تحصیلدار نے کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ دلہن کے باپ نے کیرتن کماری کو پسند کیا تھا لیکن تحصیلدار کو جو دلہن کے باپ کا دوست تھا، پتہ چل گیا۔ اُس نے سودا منسوخ کرا دیا اور قمر بائی سے بات طے کرادی۔ دولہا کے باپ نے بھی قمر بائی کی سفارش کی اور سودا پکا ہو گیا۔

نائکہ نے یہ بات پوری تفصیل سے سُنائی تھی۔ ان تفصیلات اور بظاہر ذرا ذرا سی بے معنی باتوں میں سے تفتیش کے کام کی باتیں نکل آئیں۔ جرح اور سوال در سوال کے سلسلے کے دوران پتہ چلا کہ تحصیلدار پہلے کیرتن کماری کے ہاں جایا کرتا تھا۔ وہ گاتی تھی اور ناچتی بھی تھی۔ اچھی خوبصورت تھی۔ تحصیلدار موٹا گاہک تھا اور حاکم بھی تھا۔ اڑوس پڑوس کی طوائفوں کے دلال ایک دوسرے کے موٹے گاہکوں پر نظر رکھتے اور انہیں اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تحصیلدار نے قمر بائی کو کسی شادی پر دیکھا تھا۔ وہ پہلی بار قمر بائی کے ہاں آیا تو ایک دلال نے قمر بائی کو بتایا کہ یہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہے۔ ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ قمر بائی نے اسے حسن و جوانی اور ناز و انداز کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔

تحصیلدار نے قمر بائی کو خوش کرنے کے لیے اُسے بتایا تھا کہ وہ اُس

کی خاطر کیرتن کماری کو ٹھکرا چکا ہے۔ اس کے بعد تین مرتبہ ایسے ہُوا کہ بیاہ شادی پر متعلقہ لوگوں نے کیرتن کماری سے سودا کیا لیکن تحصیلدار نے سودا منسوخ کرا کے قمر بائی کا سودا کرا دیا۔ کیرتن کماری قمر بائی کے گھر سے دو ہی گھر پرے رہتی تھی۔ ایک روز تحصیلدار نے نائکہ اور سازندوں کی موجودگی میں قمر بائی کو بتایا کہ کیرتن کماری نے اپنا ایک آدمی اُس کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ ہم سے کیا غلطی ہو گئی ہے کہ آپ ایک طوائف کے قیدی بن گئے ہیں۔ تحصیلدار نے بتایا کہ اُس نے پیغام کا جواب یہ دیا تھا کہ تم قمر بائی کے پاؤں کی خاک بھی نہیں۔ کچھ اور سخت اور طنزیہ باتیں بھی کہلا بھیجی تھیں۔

ایک روز کیرتن کماری کا ایک آدمی قمر بائی کے ایک سازندے سے ملا اور اُسے دھمکی کے لہجے میں کہا کہ اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔ تین مرتبہ کیرتن کماری کا سودا منسوخ ہُوا اور اُس کی جگہ قمر بائی چلی گئی۔ اس کے بعد کیرتن کماری اور قمر بائی کی لڑائی بھی ہوئی تھی۔ کیرتن کماری نے قمر بائی کے قریب آکر کہا تھا "کس نشے میں مست ہو، تمہارے گاہکوں کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔"

میں نے بھی بال کی کھال اُتارنی شروع کر دی۔ قتل کا باعث ان دونوں گانے والیوں کی کاروباری رقابت اور عداوت بھی ہو سکتی تھی۔ سوال پیدا ہُوا، کیا کیرتن کماری نام کی یہ گانے والی قتل کرا سکتی ہے؟ — جی ہاں! ایک طوائف دوسری طوائف کو قتل کرا سکتی ہے۔ آپ اکثر اخباروں میں پڑھتے ہوں گے کہ ایک طوائف قتل ہو گئی یا کسی طوائف پر قاتلانہ حملہ ہُوا۔ طوائفوں اور ناچنے گانے والوں کی دُنیا جرم اور گناہ کی دُنیا ہے۔ ان کے ہاں وہ لوگ جاتے ہیں جو نارمل ذہن

کے نہیں ہوتے۔ اگر آپ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو طوائف اور ناچنے گانے والی ابنارمل عورت ہوتی ہے۔ ایک تو ان کے گاہک ہوتے ہیں جو اُن کے ہاں جاتے ہیں اور واپس آجاتے ہیں۔ دوسرے تحصیلدار، دولہا اور اُس کے باپ جیسے لوگ ہوتے ہیں جو اُن کے چاہنے والے ہوتے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے ابنارمل ہوتے ہیں کہ جانتے ہُوئے کہ بازار میں بیٹھی ہُوئی پیشہ ور عورت پیسے کی یار ہے کسی انسان کی نہیں اور یہ بڑا خوبصورت دھوکہ ہے، یہ عشاق انہیں اپنا سمجھتے ہیں۔

اُن کے ہاں جانے والے تیسرے لوگ جرائم پیشہ اور نامی گرامی غنڈے استاد اور بدمعاش ہوتے ہیں۔ انہوں نے بھی ایک ایک بازاری عورت کو محبوبہ بنا رکھا ہوتا ہے۔ یہ لوگ رقابت کی تسکین چاقوؤں اور خنجروں سے کیا کرتے ہیں۔ یہ بھی نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ لہٰذا ابلیس کی اس منڈی میں خون خرابہ کوئی عجوبہ نہیں ہوتا۔

جہاں تک کیرتن کماری اور قربانی کی عداوت کا تعلق تھا، وہ بڑھتی گئی اور اس دولہا کی شادی کا وقت آگیا۔ سازندوں کے بیان کے مطابق، یہاں بھی کیرتن کماری کو بلایا گیا تھا مگر تحصیلدار نے اس کا سودا منسوخ کرا کے قربانی کی بات طے کرادی۔ یہ ممکن تھا کہ کیرتن کماری نے اسی کو قربانی اور تحصیلدار کے قتل کا باعث بنایا ہو۔

مجرم دولہا ہے یا کیرتن کماری؟

رات گذر چکی تھی۔ میرے اور راجیش کے لیے ناشتہ آگیا۔ ناشتے کے بعد راجیش، دولہا کا باپ اور دلہن کا باپ تھانے چلے گئے۔ وہ مجھے تفتیش کے

لیے ہمیں رکھنا چاہتے تھے۔ میں اُن کے ساتھ نہ گیا۔ میں وہ جگہیں غور سے دیکھتا رہا جہاں دو انسان قتل ہو گئے تھے۔ مجھے وہاں سے کچھ نہیں مل سکتا تھا لیکن میں اپنی عادت پوری کرتا رہا۔

وہ تینوں تھانے سے یہ خبر لے کر آئے کہ دونوں جاگیرداروں نے مجھے وہیں رکھنے کے لیے میرے بالائی حکّام سے اجازت لے لی ہے۔ میں اور راجیش الگ بیٹھ گئے اور جو کچھ ہمیں اُس وقت تک معلوم ہُوا تھا، اس پر بحث مباحثہ کرنے لگے۔ ہمارا ایک مشتبہ دولہا تھا۔ اس کے لیے ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ آیا تحصیلدار نے اُس کے باپ کو بتا دیا تھا کہ وہ قمر بائی کے ہاں جایا کرتا ہے؟۔ اس سوال کا جواب ہمیں کہاں سے مل سکتا تھا؟ تحصیلدار قتل ہو چکا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ دولہا اپنی زبان سے کہہ دے کہ اُس کے دل میں تحصیلدار کے خلاف یہی دشمنی تھی۔

"اس کے باپ کو گھیرتے ہیں"۔ میں نے کہا "ہو سکتا ہے وہ بتا دے۔"

"نہ باپ سے پُوچھتے ہیں نہ اُس کے بیٹے سے"۔ راجیش نے کہا — "یہاں ان پر شک کا اظہار نہ کیا جائے۔ ہمیں یہ پتہ چل چکا ہے کہ قتل کرائے کے قاتلوں نے کیا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام (نادر) بھی معلوم ہو گیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ وہ دِلّی کا سزا یافتہ بدمعاش ہے اور اُس کی ایک نشانی تو معلوم ہو گئی ہے کہ اُس کی مونچھیں مروڑی ہوئی ہیں۔ ہمارا مجرم دولہا ہے یا رکیرتن کماری۔ میرے دماغ میں یہ آئی ہے کہ کرائے کے یہ قاتل اپنا کام کامیابی سے کر چکے ہیں۔ اب وہ اپنا انعام وصول کرنے آئیں گے۔ بارات

کو جانے دیں۔ میرا زیادہ تر شک کیرتن کماری پر ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو پہلے اس شک پر کام کرتے ہیں۔ آپ بارات کے ساتھ واپس جائیں گے اور آپ ولیمے پر بھی مدعو ہوں گے۔ وہاں کے ایس۔ ایچ۔ او کو ساری واردات بتا کر ایک دو مخبر لے لینا یا اپنے مخبر ساتھ رکھنا یا کوئی اور انتظام کر لینا۔"

اُس نے ایک اور تجویز پیش کی۔ دِلّی اجمیری گیٹ (بازار حسن) کے تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او درشن سنگھ اُس کا دوست تھا۔ دونوں نے اکٹھے ٹریننگ کی تھی۔ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ اکٹھے رہے تھے۔ اُس نے کہا کہ وہ درشن سنگھ سے ٹیلیفون پر بات کرے گا اور اُسے کہے گا کہ کیرتن کماری کے کوٹھے پر نظر رکھے اور نادر کو پکڑنے کی یا اُس کا ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

تجویز اچھی تھی۔ ہم دونوں تھانے چلے گئے۔ دِلّی کی کال جلدی مل گئی۔ فون پر درشن سنگھ مل گیا۔ بات راجیش نے کی۔ اُس نے میرا حوالہ بھی دیا اور اُسے مختصراً واردات سُنائی اور کہا کہ نادر نام کا ایک سزا یافتہ بدمعاش کیرتن کماری کے گھر جائے گا اور اُس کے ساتھ ایک اور آدمی ہوگا۔ انہیں پکڑنا ہے یا ان کا ٹھکانہ معلوم کرنا ہے۔

درشن سنگھ اس تھانے میں پُرانا ہو چکا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ نادر کو جانتا ہے کیونکہ وہ تھانے کے ریکارڈ پر تھا۔ ایسے ہسٹری شیٹر تھانیداروں کو زبانی یاد ہوتے ہیں۔ درشن سنگھ کیرتن کماری کو بھی جانتا تھا۔ اُس نے میرے ساتھ بھی بات کی اور وعدہ کیا کہ وہ فوراً کارروائی کرے گا اور راجیش کو اطلاع دے دے گا۔

تحصیلدار نے مرتے وقت کچھ کہا تھا

میں نے تھانے سے آکر بارات کو جانے کی اجازت دے دی اور میں خود بھی ساتھ چل پڑا۔ دولہا اور دلہن کے باپوں نے مجھے کہا کہ میں نہ جاؤں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں تفتیش کے سلسلے میں ہی جا رہا ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا کہ ایک مشتبہ کو شامل تفتیش کرنا ہے۔ میں اب باراتی نہیں، جاسوس یا سراغرساں تھا، یا مجھے راجیش کا مخبر کہہ لیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بارات کے ساتھ کوئی نیا چہرہ تو شامل نہیں ہوا؟

بارات اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ یہ بھی میرا تھانہ نہیں تھا۔ دوسرے دن ولیمہ تھا۔ میں نے کہیں سے مخبروں کا بندوبست کرنے کی بجائے خود ہی وہاں رُکے رہنا بہتر سمجھا۔ دولہا کے باپ سے کہا کہ میرا سر چکرا رہا ہے شاید رات بھر جاگنے کا اثر ہے۔ میں نے صورت مریضوں کی سی بنا لی۔ ان لوگوں نے میری تیمارداری میں حد ہی کر دی۔ مجھے لٹا دیا لیکن میں باہر نکل کر لوگوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ایکٹنگ شروع کر دی۔ کبھی کہتا کہ دل گھبرا رہا ہے، ذرا باہر نکلوں گا۔ میں باہر نکل گیا۔

رات بھی اسی طرح گذاری۔ دیگیں پک رہی تھیں۔ ولیمے کے انتظامات ہو رہے تھے اور میں گھوم پھر کر ہر کسی کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے گھنی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والے بہت سے آدمی نظر آئے۔ وہ مونچھوں کا زمانہ تھا۔ کہا کرتے تھے کہ جس کی مونچھ نہیں وہ مرد ہی نہیں۔ آج کل نوجوانوں نے مونچھیں رکھنی شروع

کردی ہیں لیکن یہ ہندوؤں کی طرح نیچے کو رکھی جاتی ہیں۔ ہماری جوانی کے وقتوں میں کہا جاتا تھا کہ مرد جان دے دیتا ہے مونچھ نیچے نہیں کرتا۔

مونچھوں کے زمانے میں گھنی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والے کسی خاص آدمی کو الگ کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ اس کے باوجود میں نے سراغرسانی کا کمال دکھانے کی کوشش کی لیکن مجھے اپنی حماقت کا احساس ہونے لگا۔ دوسرے دن ولیمہ تھا۔ دولہا باہر آیا تو میں یہ ظاہر کیے بغیر کہ میری اُس پر نظر ہے، اُس کے ملنے والوں کو غور سے دیکھتا رہا اور اُس کی طرف بیٹھ کر کے اُس کی باتیں بھی سنتا رہا۔ میں نے وہاں اور کیا کچھ کیا، اس کی تفصیل خاصی طویل ہے، لیکن یہ کارروائی احمقانہ تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ راجیش نے جلد بازی میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں دولہا کے ساتھ رہوں۔ میں نے بھی سوچے سمجھے بغیر اُس کے کہنے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ولیمہ بھی ہو چکا تھا۔ مجھے نادر نظر نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ آیا ہو لیکن میں اُسے پہچانتا نہیں تھا۔ میں شام کی گاڑی سے واپس راجیش کے تھانے میں چلا گیا اور اُسے بتایا کہ ہمیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ ہم نے سوچنا شروع کر دیا۔ بہت بحث مباحثہ کیا۔ تان درشن سنگھ پر ہی ٹوٹتی تھی۔ وہ نادر کو جانتا تھا۔ اب میرا شک بھی کیرتن کماری پر منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے راجیش سے کہا کہ دلّی چلتے ہیں اور درشن سنگھ کی مدد سے نادر کو گھیرنے کی ترکیب کرتے ہیں۔

یہاں میں آپ کو یاد دلا دوں کہ مجھے کیوں یقین ہو گیا تھا کہ قاتل کا نام نادر ہے۔ اس کی وجوہات تو میں بیان کر چکا ہوں مگر ایک ثبوت بڑا واضح تھا۔ میں سُنا چکا ہوں کہ تحصیلدار نے مرتے وقت کچھ کہنے کے لیے ہونٹ ہلائے تھے۔

میں نے کان اُس کے ہونٹوں کے ساتھ لگایا تو مجھے اُس کی سرگوشی سُنائی دی تھی، لیکن وہ صرف "نہ" یا "نا" ہی کہہ سکا اور مر گیا۔ اس کے علاوہ اُس نے مونچھیں مروڑنے کا اشارہ کیا تھا۔ اُس وقت میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اُس نے کیوں "نہ" کہی ہے۔ جب گاڑی کے مسافروں نے بتایا تھا کہ سلیٹی رنگ کے پاجامے اور کُرتے والے نے جوگیا رنگ کے پاجامے کُرتے والے کو نادر کہہ کر پکارا تھا تو مجھے یاد آیا کہ مقتول نے نزع کے وقت "نادر" کہنا چاہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ مقتول نادر کو جانتا تھا۔

ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ دِلّی چلا جائے۔

گھنی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والا

ہم اگلی رات کو دِلّی پہنچے اور سب انسپکٹر درشن سنگھ کے مہمان بنے۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے ایک آدمی کو کیرتن کماری کے گھر پر نظر رکھنے کے لیے مقرّر کر رکھا ہے۔ یہ ایک ہی روز پہلے کی بات تھی۔ رات درشن سنگھ کے ساتھ کچھ کام کی باتیں کرتے اور کچھ گپ شپ لگاتے گذر گئی۔ نادر کے متعلّق اس نے بتایا کہ وہ چاقو زنی کا ماہر ہے اور اُس نے دو سزائیں چاقو زنی میں اور ایک سزا قتل کے کیس میں اعانتِ جرم میں کاٹی ہے۔ درشن سنگھ نے بتایا کہ نادر قتل کرنے کی اہلیّت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ درشن سنگھ نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ کیرتن کماری کے ساتھ نادر کا گہرا تعلق ہے۔

اِن معلومات کے بعد یہ ضروری نہیں تھا کہ مخبر کو وہاں بٹھایا جاتا۔ اب سوچنا یہ تھا کہ نادر پر براہِ راست حملہ کیا جائے یا پہلے کیرتن کماری کو لپیٹ میں لیا جائے۔ ہمارے پاس اس کا تو ثبوت ہی نہیں تھا کہ قتل اگر نادر نے کیا ہے تو یہ کیرتن کماری نے کرایا ہے۔ قتل دولہا بھی کرا سکتا تھا۔ ہم تینوں نے اس اقدام پر تبادلۂ خیالات کیا کہ نادر کے ٹھکانے پر چھاپہ مارا جائے۔ ہم نے اسی اقدام کو بہتر سمجھا اور طے ہُوا کہ اگلے روز ایک مخبر یہ اطلاع لانے کے لیے مقرر کیا جائے کہ نادر اپنے ٹھکانے پر موجود ہے۔

ہم سو گئے۔

صبح درشن سنگھ نے نادر کی اطلاع لانے کے لیے ایک آدمی مقرر کر دیا۔ کچھ دیر بعد درشن سنگھ کا ایک ہیڈ کانسٹیبل جو کسی کام سے باہر گیا ہُوا تھا، تھانے میں آیا اور درشن سنگھ کو بتایا کہ جس آدمی کو کیرتن کماری کے گھر پر نظر رکھنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہ نادر کے ساتھ جا رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے انہیں دُور سے دیکھا تھا۔

درشن سنگھ گہری سوچ میں چلا گیا، پھر بولا ”وہ آدمی نادر کے ساتھ جانے والا نہیں تھا، شاید کسی لالچ میں آ گیا ہو... اُٹھو۔ مجھے کچھ شک ہو گیا ہے۔“

ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ درشن سنگھ نے تین کانسٹیبل بھی ساتھ لے لیے۔ دو تانگے روک کر ہم ان میں بیٹھے اور حوض قاضی کی ایک گلی کے سامنے تانگے رُکوا کر اُترے۔ درشن سنگھ بالکل خاموش تھا جیسے اُسے معلوم ہو کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ گلیوں کے موڑ مڑتا ایک مکان کے سامنے رُکا۔ دروازے کو ہاتھ

لگایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ آگے چلا گیا اور تیسرے دروازے پر ٹک کر دستک دی۔ ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ اُس نے مسکرا کر درشن سنگھ کو سلام کیا۔ درشن سنگھ نے کہا "ذرا اُدھر جانا ہے"۔ وہ آدمی یہ کہہ کر کہ آئیے، ایک طرف ہٹ گیا۔

ہم سب اندر گئے۔ ڈیوڑھی میں سیڑھیاں تھیں۔ ان سے اُوپر گئے۔ چھت سے ایک فصیل پھلانگی۔ آگے پھر چھت تھی۔ اس سے اُتر کر درشن سنگھ سیڑھیاں اُترنے لگا۔ ہم بھی اُس کے پیچھے اُترے۔ یہ صحن تھا۔ ایک آدمی اندر سے دوڑتا باہر آیا۔ اُس کا مُنہ کُھل گیا اور آنکھیں اُبل آئیں۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے؟"

"نادرے!" درشن سنگھ نے بلند آواز سے جواب دیا "میں ہوں درشن سنگھ جہاں ہو وہیں رہنا"

درشن سنگھ نے ریوالور نکال لیا اور برآمدے میں داخل ہو کر ایک کمرے میں چلا گیا۔ ہم اُس کے پیچھے گئے۔

"یہ ہے تمہارا نادر!" درشن سنگھ نے ہمیں کہا "اور یہ جو فرش پر پڑا ہے یہ میرا آدمی ہے"

ہمارے سامنے گھنی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والا نادر کھڑا تھا اور ایک آدمی فرش پر اوندھے مُنہ پڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے رسّی سے بندھے تھے اور پاؤں بھی بندھے ہُوئے تھے۔ نادر کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی۔ درشن سنگھ نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ اسے کھولو۔

"اگر میں اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو اس آدمی کو یہ غائب کر دیتے"۔۔۔ درشن سنگھ نے کہا "میں اس مکان میں ایک بار پہلے بھی چھاپہ مار چکا ہوں۔

میں نے راستہ بنا رکھا ہے۔"

وہ تین تھانیداروں کے سامنے بے بس ہو گیا

یہ واقعہ یوں ہوا تھا کہ جو آدمی رسّیوں میں بندھا پڑا تھا، درشن سنگھ کا وہ مخبر تھا جسے اُس نے کیرتن کماری کے کوٹھے پر نظر رکھنے کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ طوائفوں اور ناچنے گانے والیوں کے ہاں رات کو رونق ہُوا کرتی ہے۔ اس بازار میں اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ چلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ دن کے وقت وہاں اُلّو بولا کرتے تھے۔ یوں کہہ لیں کہ گناہوں کی اس دُنیا کے دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ عادی جرائم پیشہ عموماً دن کے وقت طوائفوں کے ہاں جایا کرتے تھے۔ مخبر نے بتایا کہ وہ صبح کے وقت اس بازار میں ٹہل رہا تھا کہ نادر، کیرتن کماری کے گھر سے نکلا۔ نادر اُس مخبر کو جانتا تھا۔

نادر نے اُسے کہا کہ ایک ضروری کام ہے۔ ذرا ساتھ چلو۔ یہ آدمی چونکہ نادر کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا، اس لیے وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ نادر اُسے اُس مکان میں لے آیا۔ یہاں ایک آدمی پہلے سے موجود تھا۔ دونوں نے اُس کے ہاتھ پاؤں رسّیوں سے باندھ دیے اور اوندھے مُنہ گرا کر اس سے پوچھنے لگے کہ وہ کل سے اس بازار میں کیا کر رہا ہے۔ نادر کو معلوم تھا کہ یہ آدمی پولیس کا مخبر ہے۔ اُس نے نادر سے کہا کہ وہ اپنے کام سے گھوم پھر رہا تھا۔

نادر نے اُس کی پیٹھ پر بید کی چھڑی اتنے زور سے ماری کہ وہ طبلا اٹھا۔

نادر نے اُسے کہا کہ وہ مان جائے کہ اُسے اُس (نادر) کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ آدمی نہیں مان رہا تھا۔ اسے اور زیادہ مارا پیٹا گیا۔ اتنے میں ہم پہنچ گئے۔

"دیکھو نادرا!" — میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "وہ جوگیا رنگ کے کپڑے اور اپنے ساتھی کے سلیٹی رنگ کے کپڑے اور چاقو یا خنجر جو بھی تم نے استعمال کیا تھا، خود ہی نکال دو۔"

"مان جا نادرے!" — درشن سنگھ نے کہا — "سودا کرادوں گا۔ موقعے کے گواہ موجود ہیں۔ تم دونوں کو شناخت کرلیں گے۔"

"اور تحصیلدار کا نزعی بیان بھی ہے" — راجیش نے کہا — "اُس نے تمہارا نام لے کر بیان دیا تھا۔ پھانسی سے بچنا چاہتے ہو تو برآمدگی کرادو، ورنہ ہم خود تلاشی لیں گے تو ہماری تمہاری دوستی ختم ہو جائے گی۔ تمہارا جرم ثابت ہے پھر بھی دُرگی جیسے (سی۔ آئی۔ اے) کے حوالے کردیں گے۔ تم جانتے ہو وہاں تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہوگا۔ جسم پر کھال نہیں رہے گی، پھر سزا بھی پاجاؤ گے۔"

وہ تھا تو پکّا جرائم پیشہ مگر تین تھانیداروں کے سامنے وہ بے بس ہو گیا۔ اُس پر ذرا سا بھی تشدّد نہ کیا۔ ہم تینوں نے صرف زبان سے اُس سے ہتھیار ڈلوا لیے۔ محلّے کے تین چار آدمی بُلا لیے۔ نادر نے اُن کے سامنے اپنا جوگیا سوٹ اور اپنے ساتھی کا سلیٹی سُوٹ نکال دیا۔ معلوم ہُوا کہ یہی آدمی جو اُس کے ساتھ تھا، دوہرے قتل میں اُس کا ساتھی تھا۔

مزید تلاشی میں دو بڑے کمانی دار چاقو اور دو خنجر برآمد ہوئے۔ چرس بھی برآمد ہوئی اور جامہ تلاشی میں نادر کی جیب سے اڑھائی ہزار کے نوٹ برآمد ہوئے۔

یہ تحصیلدار اور قربانی کے قتل کی اُجرت تھی جو اس نے اسی صبح کیرتن کماری سے وصول کی تھی۔ اُس دور کے اڑھائی ہزار روپے آج کے پندرہ ہزار روپے کے برابر تھے۔

بارات کے ساتھ قاتل

اس قسم کے جرائم پیشہ کا پولیس کے جال سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ ان دونوں کو ہم تھانے لے گئے۔ نادر چونکہ اپنی دُنیا کا اُستاد تھا اس لیے اُس نے اقبالِ جرم کے عوض درشن سنگھ سے اپنے کسی پہلے کیس کا سودا کرنا چاہا۔ راجیش نے کیس کے متعلق پوچھا۔ درشن سنگھ نے بتایا تو راجیش نے اُسے کہا کہ نادر کو یہ انعام دے دو۔ ضروری نہیں کہ میں آپ کو کیس سناؤں۔ ہسٹری شیٹڑ افراد کے ساتھ بعض حالات میں اس قسم کی سودا بازی کرنی پڑتی ہے۔ میں نادر اور اُس کے ساتھی کی اس دوہرے قتل کی واردات میں کوئی سودا بازی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اپنے تجربے پر اعتماد تھا کہ اتنی شہادت موجود ہے اور خانہ پُری کی بھی گنجائش ہے کہ ان دونوں کو سزا دلائی جا سکے۔ یہ کیس راجیش کا تھا۔ اُس نے جو بہتر سمجھا وہ کیا۔

نادر کا اقبالی بیان اُس کے ساتھی سے الگ لیا گیا۔ اُس کے جُرم کی داستان یُوں ہے کہ کیرتن کماری کے ساتھ اُس کے گہرے مراسم تھے۔ اس کلاس کی طوائفیں خصوصاً ناچنے گانے والیاں نادر کی طرح کے اُستاد غنڈوں کو اپنی حفاظت اور اپنے کاروبار کے تحفظ کے لیے اپنے جال میں رکھتی ہیں اور ان کا ہر مطالبہ پورا

کرتی رہتی ہیں۔ وہ ایک دوسری پر اپنے اپنے غنڈوں کا رعب بھی گانٹھتی رہتی ہیں۔ کیرتن کماری نے نادر کو بتایا کہ قمر بائی اُس کے گاہکوں کو لے گئی ہے اور تحصیلدار اُس کی مدد اور پُشت پناہی کر رہا ہے۔ اُس نے نادر کو وہی تفصیلات بتائیں جو میں آپ کو سُنا چکا ہوں۔ کیرتن کماری یہ چوٹ برداشت نہ کر سکی کہ ان جاگیرداروں کے لڑکے لڑکی کی شادی پر اُسے بلایا گیا تھا لیکن تحصیلدار قمر بائی کو لے گیا۔ اس شادی پر اُسے ہزارہا روپوں کی ویلوں کی توقع تھی۔ اپنا معاوضہ الگ تھا۔ اس قسم کے دولت مندوں کے ہاں تو گانے والیاں بلا معاوضہ جانے کو بھی تیار ہو جاتی تھیں کیونکہ صرف ویلیں اتنی ہو جاتی تھیں جو وہ کوٹھے پر پورے مہینے میں نہیں کما سکتی تھیں۔

کیرتن کماری نے نادر پر شراب کا اور اپنے حسن و جوانی کا نشہ طاری کر کے ایسا بھڑکایا کہ وہ تحصیلدار اور قمر بائی کے قتل پر تیار ہو گیا۔ کیرتن کماری نے اڑھائی ہزار روپیہ نقد پیش کیا اور کہا کہ دونوں کو ختم کر آؤ اور رقم لے لو۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ لوگ ذہنی مریض ہوتے ہیں اور انتہا پسند۔ ان کی سوچوں کو علم نفسیات کے ڈاکٹر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

بارات گئی تو نادر اپنے ایک ساتھی کو ساتھ لے کر لڑکی والوں کے گاؤں چلا گیا۔ دونوں کے پاس خنجر تھے۔ نادر نے جو کپڑے اور اُس کے ساتھی نے (جس کا نام ذہن سے اُتر گیا ہے) سلیٹی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دونوں نے اوپر قیمتی چادریں لے رکھی تھیں اور فلیٹ شُوز پہنے تھے۔ وہ شام سے ذرا پہلے وہاں پہنچے۔ نادر نے اپنے بیان میں کہا کہ اُسے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر تک اِرد گرد

کے دیہات کے تماشائی جمع ہونے شروع ہو جائیں گے پھر ان دونوں کو کوئی نہیں پہچان سکے گا۔

ایسے ہی ہُوا۔ دونوں تماشائیوں میں شامل ہو گئے۔ نادر بہت چالاک آدمی تھا۔ اُس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ قمر بائی کو کس کمرے میں ٹھہرایا گیا ہے۔ اُس کی نظر تحصیلدار پر بھی تھی۔ وہ ان دونوں کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا کیونکہ دونوں اُسے جانتے تھے۔ تحصیلدار اُسے اس لیے زیادہ جانتا تھا کہ ایک بار وہ تحصیلدار سے ملا اور درخواست کے لہجے میں اُسے کہا تھا کہ وہ کیرتن کماری کے کاروبار کو تباہ نہ کرے۔ تحصیلدار نے اُسے ڈانٹ دیا اور کہا تھا۔ "کیرتن کماری مجھے غنڈوں سے ڈرا رہی ہے؟"

"میں غنڈہ بن کے نہیں آیا حضور!" نادر نے کہا تھا۔ "ایک عرض کرنے آیا ہوں"۔ تحصیلدار نے حاکمانہ لہجے میں ہی باتیں کیں۔ تب نادر نے اُسے کہا۔

"اگر حضور یہ چاہتے ہیں کہ میں غنڈے کے رُوپ میں جناب کے سامنے آؤں تو کسی دن آجاؤں گا"۔

"میں تمہیں دس مقدموں میں پھانس کر ساری عمر کے لیے جیل بھجوا دوں گا" ——— تحصیلدار نے کہا تھا۔

نادر اُسے یہ کہہ کر چلا آیا تھا۔ "پہلے علاقے کے ڈی۔ ایس۔ پی سے بات کر لینا"۔

قمر بائی قاتلوں کو دیکھ کر اُٹھی

شادی کی تقریب میں نادر نے قمر بائی کو بھی دیکھا اور تحصیلدار کو بھی۔

اس کا ساتھی بھی دونوں کو جانتا پہچانتا تھا۔ نادر نے ابھی یہ نہیں سوچا تھا کہ انہیں کہاں قتل کرے گا۔ یہ موقع محل کے مطابق تھا۔ قمر بائی دو چار گانے سُنا کر حویلی کے اندر چلی گئی۔ نادر اور اُس کا ساتھی بھی اُدھر گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ حویلی کا یہ حصہ شارع عام بنا ہوا تھا۔ دیہاتی تماشائی قمر بائی کو قریب سے دیکھنے کے لیے حویلی کے اندر چلے گئے تھے۔ نادر بھی اپنے ساتھی کے ساتھ اندر چلا گیا اور دونوں اُس کمرے تک چلے گئے جو قمر بائی کو دیا گیا تھا۔

قمر بائی کو اُن کے ہاتھوں مرنا تھا۔ تماشائی جو اندر آ گئے تھے، بائی کے کمرے کا دروازہ بند ہوتے دیکھ کر چلے گئے۔ نادر اور اُس کا ساتھی بھی پیچھے ہٹ آئے اور قمر بائی کی نائکہ اور سازندے بھی باہر چلے گئے۔ قاتلوں کے لیے میدان خالی ہو گیا۔ دونوں قاتل اندر چلے گئے۔ قمر بائی انہیں دیکھ کر اُٹھی۔ نادر ماہر خنجر زن تھا۔ اُس نے قمر بائی کے پیٹ میں خنجر مار کر ایک طرف کو جھٹکا دیا اور اُس کے ساتھی نے اُس کے دل پر خنجر مارا۔ قمر بائی کی آواز تک نہ نکلی اور وہ گر پڑی۔ دونوں باہر نکل گئے۔

دونوں نے طے کر رکھا تھا کہ اگر وہ الگ الگ ہو گئے تو ایک دوسرے کا انتظار ساتھ والے سبزیوں کے باغ کے باہر کریں گے۔ انہوں نے جگہ مقرر کر رکھی تھی۔ قمر بائی کو قتل کر کے دونوں باہر آ گئے۔ اُس کا ساتھی لاپتہ ہو گیا۔ اُس نے اپنے اقبالی بیان میں کہا تھا کہ اُس میں دوسرے قتل کی ہمت نہیں رہی تھی، اس لیے وہ وہاں سے کھسک گیا اور سبزیوں کے باغ کے باہر مقررہ جگہ چلا گیا۔ اِدھر نادر دیکھتا رہا کہ اب کیا ہو گا اور کیا وہ تحصیلدار کو قتل کر سکے گا؟

تھوڑی ہی دیر بعد قتل کا انکشاف ہو گیا اور حویلی کے اندر ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ نادر نے تحصیلدار پر نظر رکھی۔ وہ اندر گیا تو نادر بھی اندر چلا گیا۔ برآمدے میں روشنی کم تھی اور ہجوم زیادہ۔ نادر نے سامنے سے آکر خنجر جو اُس نے چادر میں چھپا رکھا تھا، تحصیلدار کے پیٹ میں پھیر دیا۔ تحصیلدار نے نادر کا چہرہ دیکھ لیا اور خنجر کھا کر بولا ـــ "اوئے نادرے! یہ کیا؟" ـــ اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر آگے کو گرا۔ سب سے پہلے نادر نے، بلند آواز سے کہا۔ "اوے اسے دیکھو کیا ہو گیا ہے"۔

جب ہجوم اِدھر متوجہ ہُوا تو نادر اِدھر اُدھر ہو گیا۔ وہ وہاں سے فوراً نکل جانا چاہتا تھا مگر ہجوم جس کی صورت دریا میں بھنور جیسی ہو گئی تھی، اُسے پیچھے کو اور اِدھر اُدھر دھکیل رہا تھا۔ وہ جلدی نکل نہ سکا۔ اتنی دیر میں اعلان ہُوا کہ جو جہاں کھڑا ہے وہیں بیٹھ جائے۔ نادر نے دروازہ بند ہوتے دیکھا۔ ہجوم بیٹھ گیا۔ نادر کو نکلنا تھا۔ اُس کے پاس خون آلود خنجر تھا اور اُس نے اپنا جائزہ تو نہیں لیا تھا لیکن اُسے ڈر تھا کہ اُس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے ہوں گے۔ اُس نے چادر اسی مقصد کے لیے لے رکھی تھی۔

اُس نے جب دیکھا کہ وہ دروازے میں سے گزرتے پکڑا جائے گا تو اُس نے بیٹھے بیٹھے کوئی اور راستہ دیکھنا شروع کر دیا۔ اُسے نیم کا درخت اور دیوار تک گیا ہُوا ٹہن نظر آیا۔ وہ اُٹھا اور نہایت تیزی سے درخت پر چڑھ گیا۔ اُس نے شور بھی سُنا ـــ "وہ گیا۔ وہ گیا" ـــ وہ بلی کی طرح ٹہن پر گیا۔ باہر کو کُودا اور گاؤں سے نکل گیا۔ سبزیوں والے باغ سے گذرا۔ اُس کا ساتھی اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ رات کو ایک مسافر گاڑی گزرتی ہے۔ وہ دونوں ریلوے

سٹیشن پہنچے اور گاڑی آگئی۔ وہ انجن سے ذرا ہٹ کر کھڑے رہے۔ گاڑی چلی تو وہ پہلے ڈبے پر سوار ہو گئے۔

گاڑی جب میرے کہنے پر ایک سٹیشن پر زیادہ دیر رُکی رہی تو انہیں شک ہُوا۔ وہ بہت محتاط تھے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ اُن کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں چھپانے کے لیے انہوں نے چادریں اوڑھی اور نیچے لٹکا لیں۔ نادر کے ساتھی نے دیکھا کہ پولیس آ رہی تھی۔ اُس نے نادر کو بتایا۔ دونوں دوسری طرف اُتر گئے اور پیدل سات آٹھ میل چل کر اپنے ایک دوست کے ہاں پہنچے۔ اُس کے ہاں انہوں نے کپڑوں سے خون دھویا اور خنجر صاف کیے۔ رات وہاں گذاری اور اگلی شام دِلّی پہنچے۔

نادر رات کو کیرتن کماری کے ہاں نہ گیا کیونکہ رات کو وہ مصروف ہوتی تھی۔ وہ رات کے آخری پہر گیا۔ کیرتن کماری کو کامیابی کی خوشخبری سُنائی۔ اڑھائی ہزار وصول کیا۔ کچھ دیر وہاں سویا اور جب باہر نکلا تو اُسے درشن سنگھ کا مخبر نظر آیا۔ اُس کے انداز سے اُسے شک ہُوا۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو اُسے مخبر پر شک نہ ہوتا۔ وہ نادر تھا جو اپنے فن کا ماہر اور اُستاد تھا اور پولیس کی کارروائیوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس نے مخبر کے ساتھ دوستانہ پیار سے باتیں کیں اور اُسے کسی کام کے بہانے اپنے ساتھ لے گیا۔ اپنے گھر لے جا کر اُس نے مخبر کے ساتھ جو سلوک کیا وہ آپ کو سُنا چکا ہوں۔

اس کے ساتھی نے الگ اقبالی بیان دیا۔ دونوں کے بیانوں میں کچھ فرق تھا جو ہم نے پُورا کر لیا۔ دونوں نے مجسٹریٹ کو بھی بیان قلمبند کرا دیے۔ ہم

نے کیرتن کماری کو بھی گرفتار کر لیا۔ میں اپنے تھانے میں چلا گیا۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ راجیش ملزموں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ وہ ذہین آدمی تھا۔ مقدمہ تیار کرنا جانتا تھا۔ مجھے اطلاعیں ملتی رہیں۔ نادر اور اُس کا ساتھی سیشن کورٹ میں جا کر اقبالی بیانوں سے منحرف ہو گئے لیکن راجیش نے کوئی خانہ خالی نہیں رہنے دیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ نادر جیسے اُستاد عدالت میں جا کر اپنی چال چلا کرتے ہیں۔ اس کا اُس نے اپنے گواہوں کے ذریعے پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ نادر اور اُس کے ساتھی کو سزائے موت دی گئی اور کیرتن کماری کو چار سال سزائے قید ملی۔ اُس نے روپے پیسے کے زور پر بڑا قابل وکیل کیا تھا مگر وہ اُنہیں سزا سے بچا نہ سکا۔ اُن کی اپیلیں بھی مسترد ہو گئیں۔

پیلا رومال، لال ست سری اکال

چوری جسے پولیس کی زبان میں سرقہ کہتے ہیں، معمولی سی واردات سمجھی جاتی ہے۔ تھانوں میں چوری کی وارداتوں کی رپورٹیں ہر روز آتی اور اکثر کاغذوں میں ہی دفن ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ چوری کو معمولی سی واردات سمجھ کر اس کی تفتیش میں دلچسپی نہیں لی جاتی بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ مشکل تفتیش جس واردات کی ہے، وہ سرقہ ہے۔ قتل ایک گھناؤنا اور ہولناک جُرم ہے لیکن تھانیدار تجربہ کار اور اپنے فرائض میں دلچسپی لینے والا ہو تو قتل کی تفتیش مشکل نہیں ہوتی۔ البتہ قتل کے ساتھ ایک کہانی وابستہ ہوتی ہے اور چوری صرف چوری ہوتی ہے۔

چوری کی سو میں سے ایک واردات ایسی ہوتی ہے جس کے پیچھے ایک ڈرامہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک واردات کی تفتیش پیش کرتا ہوں۔
وہ گاؤں خاصا بڑا تھا۔ آبادی چار ہزار نفوس سے زیادہ ہو گی۔ اس میں ہندو، سکھ اور مسلمان آباد تھے۔ مسلمانوں کی تعداد تھوڑی تھی۔

اس علاقے کی زمین زرخیز تھی۔ دُور دُور تک فصلوں کی ہریالی نظر آتی تھی۔ یہ گاؤں تھانے سے دو اڑھائی میل دُور تھا۔ ایک سکھ جو شکل وصورت اور لباس سے معزز لگتا تھا، تھانے میں آیا۔ اُس کے ساتھ نمبردار بھی تھا اور چوکیدار بھی۔ سکھ کا نام دربار سنگھ تھا، پانچ سات مہینے گزرے صوبیداری پنشن پر گھر آیا تھا۔ اُس کی زمینداری ذرا بڑے پیمانے کی تھی۔

اُس نے رپورٹ لکھوائی کہ اُس کے گھر سے ڈیڑھ ہزار روپیہ چوری ہوگیا ہے۔ یہ خاص طور پر نوٹ کریں کہ یہ اچھے وقتوں کا واقعہ ہے جب ڈیڑھ ہزار روپیہ آج کے ڈیڑھ لاکھ روپے کے برابر ہوتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار کسی بڑے ہی امیر آدمی کے گھر میں ہوتا تھا۔

میں نے اُس سے وہ سب باتیں پوچھیں جو چوری کی رپورٹ پر پوچھی جاتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ نقب لگی ہو گی یا گھر والے گھر نہیں ہوں گے اور تالہ ٹوٹا ہو گا مگر یہاں بات ہی کچھ اور نکلی۔ رقم جو دس اور پانچ روپے کے نوٹوں کی شکل میں تھی، ایک ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے ایک کپڑے میں بندھی رکھی تھی۔ ٹرنک کا تالہ نہیں توڑا گیا تھا۔ اس کے پیچھے دو قبضے تھے، وہ اکھاڑے گئے تھے۔ ٹرنک کے نیچے ایک اور ٹرنک اور اس کے اُوپر دو چھوٹے صندوق تھے۔ یہ سب قرینے سے رکھے ہوتے تھے۔

سکھ صوبیدار کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چوری کب ہوئی۔ سکھ کی بیوی نے ٹرنک کا تالہ کھولا تو اس کا ڈھکنا الگ ہو گیا۔ دیکھا کہ پیچھے سے قبضے اُکھڑے ہوتے ہیں۔ سکھ کی بیوی کو فوراً رقم کا خیال آیا۔ کپڑے اُٹھا

کر دیکھا۔ رقم غائب تھی۔ لہٰذا یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ رقم کب چوری ہوتی۔

"اس سے پہلے آپ نے یہ ٹرنک کب کھولا تھا؟"

"صحیح جواب تو میری بیوی دے سکتی ہے"۔۔۔ سکھ نے کہا۔۔۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے، یہ ٹرنک آٹھ دس روز پہلے میری بیوی نے کھولا تھا"

"اس روز رقم ٹرنک میں موجود تھی؟"

"مجھے معلوم نہیں"

"کیا ان آٹھ دس دنوں میں آپ کے گھر کے تمام افراد کبھی گھر سے یا گاؤں سے باہر گئے تھے؟"

"تین روز گزرے ہم اپنی بڑی بیٹی کے گھر گئے تھے"۔۔۔ سکھ صوبیدار نے جواب دیا۔۔۔ "گھر کو تالا لگا کر گئے تھے"

اس نے تفصیل یہ بتائی کہ اس کی ایک بیٹی گاؤں میں ہی شادی شدہ ہے۔ اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تھا۔ سکھ، اپنی بیوی اور ایک غیر شادی شدہ بیٹی کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی کے گھر گیا تھا۔ وہ دوپہر تک وہاں رہے۔ اندر بڑے کمرے کو تالا لگا دیا تھا۔ ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے کو بھی تالا لگا دیا تھا اور باہر والے دروازے کی زنجیر چڑھا دی تھی۔ دیہات میں ڈاکے پڑا کرتے اور نقب لگا کرتی تھی، دن دہاڑے چوری کم ہی ہوتی تھی۔ یہ لوگ واپس آتے تو باہر زنجیر چڑھی ہوتی تھی اور اندر کے دونوں دروازوں پہ تالے لگے ہوتے تھے۔

"گھر میں کون کون ہے؟"

سکھ صوبیدار اور اس کی بیوی کے علاوہ اِن کے دو بیٹے تھے۔ دونوں جوان تھے لیکن غیر شادی شدہ اور ایک ان کی بہن تھی جس کی عمر اٹھارہ اُنیس سال تھی۔ اُس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ گھروں میں بعض اوقات گھر کا ہی کوئی فرد چوری کر لیا کرتا ہے۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ صوبیدار کے دونوں بیٹے کس قماش کے ہیں۔ میں نے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ اُس کے بیٹوں پر مجھے شک ہے۔ اس کی بجائے میں نے اُس سے پوچھا کہ اس کے بیٹے کیا کرتے ہیں۔ اُس نے بتایا کہ زمین زیادہ ہے۔ دونوں بیٹے مزارعوں اور کھیتوں کی دیکھ بھال کرتے اور خود بھی کھیتی باڑی کرتے ہیں سکھ کچھ عقل والا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے خود ہی کہہ دیا ___ "میں نے چھبیس سال فوج کی سروس کی ہے۔ میں سیدھی بات کرنے کا اور کسی کا لحاظ نہ کرنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ مجھے پہلا شک اپنے لڑکوں پر تھا لیکن میرا شک غلط نکلا۔ ان میں کوئی بُری عادت نہیں۔ شراب تو ہر کوئی پیتا ہے۔ اُن میں کوئی عیب نہیں۔ جُوا نہیں کھیلتے۔ شہر بھی نہیں جاتے۔"

میں نے اُس کے بیٹوں کے متعلق بات آگے نہ بڑھائی۔ اُن کی صحیح رپورٹ مجھے مخبروں سے لینی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ ایک بار پھر سوچ لے۔ اگر رپورٹ درج ہو گئی، ایف۔ آئی۔ آر تحریر ہو گئی اور پتہ چلا کہ چوری اُس کے بیٹوں نے کی ہے تو انہیں سزا ملے گی۔ اُس نے کہا کہ میں رپورٹ رجسٹر کر لوں۔ نمبردار نے پُر زور انداز سے کہا کہ صوبیدار کے لڑکے ایسے نہیں کہ اپنے گھر کو ہی لُوٹ کھائیں۔ اُس نے

دونوں کے چال چلن کی تعریف کی اور چوکیدار نے نمبردار کی تائید میں بہت کچھ کہا۔

میں اتنا سمجھ گیا کہ چوری کچھ دن پہلے ہوئی ہے اور انہیں آج پتہ چلا ہے۔ جاتے واردات پر مجھے اب کوئی کھرا کھوج نہیں مل سکتا تھا۔ تاہم وہاں جانا ضروری تھا۔ میں کاغذی کارروائی مکمل کر کے سکھ صوبیدار کے ساتھ چل پڑا۔

تالے نہیں ٹوٹے

مکان پکا تھا۔ اس کے دائیں بائیں مکان تھے اور پچھواڑے کے مکانوں کے پچھواڑے ان سے ملے ہوئے تھے۔ سکھ کے مکان کی ڈیوڑھی تھی۔ آگے صحن۔ باقی تین اطراف برآمدے اور کمرے۔ سکھ مجھے ایک بڑے کمرے میں لے گیا۔ اس کے دائیں اور بائیں کوٹھڑیوں کی طرح کے دو چھوٹے کمرے تھے۔ ایک چھوٹے کمرے میں ٹرنک رکھے تھے اور بہت سا دوسرا سامان بھی تھا۔

جس ٹرنک سے رقم چوری ہوئی تھی وہ وہیں پڑا تھا۔ پرانے زمانے سے بھی پہلے کا ٹرنک تھا۔ اس کے پیچھے دو قبضے لگے ہوتے تھے جو زنگ خوردہ تھے۔ انہیں کسی مضبوط اوزار سے اکھاڑا گیا تھا۔ میں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ میں نے سوچا تھا کہ چوری گھر کے کسی فرد

نے کی ہے تو اوزار یہیں کہیں ہو گا، لیکن مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی۔
یہ بات بالکل صاف تھی کہ چور جو کوئی بھی ہے، اُسے معلوم تھا کہ رقم اس ٹرنک میں ہے اور کپڑوں کے نیچے رکھی ہے۔ میں نے سکھ صوبیدار سے پوچھا کہ جب اُس کی بیوی نے یہ ٹرنک کھولا تو اس میں رکھے ہوئے کپڑوں کی کیا حالت تھی؟
"بالکل ٹھیک پڑے تھے" — اس نے جواب دیا — "میں نے خود دیکھے تھے۔"
اس کا مطلب یہ ہوا کہ چور کو رقم تلاش کرنے کے لئے کپڑے باہر نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اگر چور باہر کا کوئی آدمی تھا تو اُس نے واردات گھر بھیدی کی مدد سے کی ہے۔ گھر بھیدی وہی ہو سکتا یا ہو سکتی تھی جس کا عمل دخل اس اندرونی کمرے تک تھا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ٹرنکوں وغیرہ کی انچارج گھر کی عورت ہوا کرتی ہے۔ چابیاں اُسی کے پاس رہتی ہیں، اس لئے میں نے صوبیدار کی بیوی سے تفتیش کی ابتدا بہتر سمجھی۔ اس سے پہلے میں نے مکان کی سیڑھیاں اور ان کا دروازہ دیکھا۔ اوپر گیا۔ چھت دیکھی۔ ملحقہ مکانوں کی چھتوں سے ادھر آیا جا سکتا تھا۔ نمبردار، سکھ صوبیدار اور ذیلدار میرے ساتھ تھے۔
میں نے ملحقہ گھرانوں کے متعلق پوچھا تو تینوں نے متفقہ طور پر کہا کہ سب شریف لوگ ہیں۔ میں نے اُن سے تو کچھ نہ کہا، اپنے طور پر سوچا کہ ضروری نہیں ہوتا کہ شریف لوگوں کی اولاد بھی شریف ہی ہو۔ بہرحال مکان

ایسا تھا کہ چور اُوپر سے آ اور جا سکتا تھا۔ میں نے سکھ کی بیوی کو الگ بٹھالیا۔
چابیاں اس کی تحویل میں رہتی تھیں۔ گاؤں کے لوگ روپیہ پیسہ گھروں میں ہی رکھا کرتے تھے اس لئے چابیاں ایسی جگہ رکھتے تھے جہاں توقع ہی نہیں ہوتی تھی کہ چابیاں ہوں گی۔ یہ عورت ایک پرانی ہانڈی میں چابیاں رکھتی تھی جس میں مسور کی دال پڑی رہتی تھی۔ تین ہانڈیاں اس کے اُوپر رکھی رہتی تھیں۔ کسی ہانڈی میں گڑ اور کسی میں ہلدی اور کسی میں ایسی ہی کوئی اور چیز تھی۔ یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ ٹرنک کا تالہ نہیں ٹوٹا، ڈھکنا اکھاڑا گیا ہے۔ ڈھکنا اکھاڑنے کے لئے وقت درکار تھا اور اس سے آواز بھی پیدا ہوتی تھی، اس لئے چوری رات کو کی گئی ہوگی جب گھر والے صحن میں سوتے ہوتے ہوں گے یا اُس وقت جب گھر کوئی بھی نہیں ہوگا۔
صوبیدار کی بیوی نے یہ بتا کر مجھے اُلجھن میں ڈال دیا کہ نیچے والے ٹرنک میں زیورات تھے جو لڑکی اور اُس کے دونوں بھائیوں کی شادیوں کے لئے بنوائے گئے تھے۔ میں کہتا تھا کہ چوری کسی گھر بھیدی کی مدد سے کی گئی ہے۔ اب میں اس اُلجھن میں پڑ گیا کہ گھر بھیدی کو اگر اس رقم کا علم تھا تو کیا اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے نیچے زیورات بند ہیں؟ —
اُسے ضرور معلوم ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ چور کو صرف رقم کی ضرورت تھی۔ اگر وہ چوری کے ارادے سے آتا یعنی جو ہاتھ لگا اٹھا لے جانے کے لئے آتا تو دوسرے ٹرنک بھی کھولتا۔ دوسرے ٹرنک نہ کھولنے

کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ کوئی جاگ اُٹھا ہو گا یا کوئی باہر سے آ رہا ہو گا۔
میں نے تھانے میں صوبیدار سے جو باتیں پوچھی تھیں، وہ اُس کی بیوی سے بھی پوچھیں۔ اُس نے بھی بتایا کہ آٹھ دس روز پہلے ٹرنک کھولا تھا اور رقم موجود تھی۔ آج صبح کھولا تو رقم غائب پائی۔ رقم ریشمی رومال میں بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ رومال کی کوئی خاص نشانی ہے؟ —اُس نے بتایا کہ رومال پیلے رنگ کا ہے اور اس کے درمیان میں اُس کی چھوٹی بیٹی نے لال دھاگے سے گورمکھی میں "ست سری اکال" کاڑھا ہوا ہے۔
گھر میں ایک نوکرانی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر تھی اور ایک جوان آدمی گھر کے کام کاج کے لئے بھی آتا تھا۔ وہ دراصل مزارعہ تھا۔ سکھ کی بیوی نے ان کے متعلق کہا کہ دونوں مرے میٹے سے ہیں اور ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد۔ اُس نے کہا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ کون سے ٹرنک میں کیا رکھا ہے۔
"تم نے آٹھ دس دِن پہلے ٹرنک کھولا تھا یا آج کھولا ہے"— میں نے پوچھا — "اس دوران تم سب لوگ کسی دن گھر سے باہر گئے تھے؟"
"تین دن گزرے اپنی بڑی بیٹی کے گھر گئے تھے"— اُس نے جواب دیا — "میں گئی تھی۔ اجیت کور (چھوٹی بیٹی) ساتھ تھی اور اس کا باپو (صوبیدار) بھی ساتھ تھا۔ ہم صبح گئے اور دوپہر کے بعد واپس آئے تھے۔"

"تمہارے دونوں بیٹے نہیں گئے تھے؟"

"وہ کھیتوں کو چلے گئے تھے" — اس نے جواب دیا — "آپ دیکھ رہے ہیں، کٹائی ہو رہی ہے۔"

"گھر کون رہا تھا؟ ..... نوکر اور نوکرانی؟"

"نہیں" — اس نے جواب دیا — "گھر کو تالے لگا کر گئے تھے۔"

"تالے کہاں کہاں لگائے تھے؟"

"ایک اس بڑے کمرے کو" — اس نے کہا — "دوسرا ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے کو، اور ڈیوڑھی کے باہر والے دروازے کی باہر سے زنجیر چڑھا دی تھی۔ وہاں تالہ لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی کھول بھی لے تو ڈیوڑھی سے اندر آنے کا کوئی راستہ نہیں۔"

"جب تم لوگ واپس آئے تو تالے لگے ہوئے تھے؟" — میں نے پوچھا — "تمہیں کوئی شک نہیں ہوا؟"

"لگے ہوئے تھے" — اس نے جواب دیا — "مجھے کچھ بھی شک نہیں ہوا۔"

میں نے دونوں تالے منگوا کر دیکھے۔ ان پر ایسا کوئی نشان نہیں تھا جو ظاہر کرتا کہ یہ تالے سلاخ سے یا کسی اوزار سے کھولے گئے ہوں۔ اگر اس طرح کھولے جاتے تو پھر بند نہ ہوتے۔ صوبیدار کی بیوی نے کہا تھا کہ اس نے واپس آکر دیکھا۔ تالے بند تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تالے اسی قسم کی دوسری چابیوں سے کھولے گئے پھر لگا دیئے گئے ہوں۔

شبہ بیٹی پر بھی

میں نے سوچا کہ تالے، سلاخ وغیرہ سے کھولے جاتے تو چور ٹرنک کا تالہ بھی کھول لیتا۔ چور نے ڈھکنا کیوں اکھاڑا ہے؟ مجھے شک ہونے لگا کہ چور اسی گھر میں ہے اور تالے کھولنے کے لئے دوسری چابی استعمال کی گئی ہے۔ میں نے اشاروں اشاروں میں سکھ کی بیوی سے معلوم کرنا چاہا کہ یہ کارستانی اُس کے کسی بیٹے کی ہو سکتی ہے۔ معلوم نہیں وہ میرے اشارے سمجھ سکی یا نہیں، البتہ اُس نے ایسی باتیں کیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے اپنے بیٹوں پر شک نہیں۔ مجھے یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ چوری اسی روز ہوئی ہے جس روز یہ لوگ اپنی بڑی بیٹی کے گھر گئے تھے۔

"ان تالوں کی دوسری چابیاں بھی ہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"دونوں تالوں کی ہیں" — اُس نے جواب دیا — "ٹرنک کے تالے کی نہیں"۔

"وہ اسی گچھے میں ہیں؟"

"نہیں" — اُس نے بتایا — "تین چار تالوں کی دوسری چابیاں الگ گچھے میں ہیں۔ اجیت کور کے باپو نے ایک بار کہا تھا کہ ہر تالے کی دوسری چابی الگ رکھنی چاہیئے۔ ایک ہی گچھے میں تمام چابیاں ہوں اور

گچھا گم ہو جائے تو دوسری چابیاں بھی ساتھ ہی جاتی ہیں، پھر تالے توڑنے پڑتے ہیں۔"

سکھ چونکہ چھبیس سال فوج میں رہا تھا اس لئے عقل کی بات کرتا تھا۔

میں نے اُس کی بیوی سے پوچھا کہ دوسری چابیاں کہاں ہیں۔ اُس نے بتایا کہ ایک سوٹ کیس میں رکھی ہیں۔ میرے کہنے پر وہ چابیاں لے آئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ اُسی جگہ رکھی تھیں جہاں ہونی چاہئیں تھیں یا اِدھر اُدھر تھیں؟ — اُس نے بتایا کہ جہاں رکھی رہتی تھیں، وہیں تھیں۔ میں نے چابیوں کو غور سے دیکھا لیکن ان سے مجھے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ چابیاں تو مجھے کچھ بھی نہیں بتا سکتی تھیں۔

میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ جتنی دیر اپنی بڑی بیٹی کے گھر رہی، چابیاں اُسی کے پاس رہیں۔ وہ ذرا سوچ کر بولی — "نہیں۔ کچھ دیر بعد چابیوں کا گچھا اجیت کور نے لے لیا تھا اور اُسی کے پاس رہا تھا۔"

"اُس نے کیوں لے لیا تھا؟"

"میں نے گچھا چارپائی پر رکھ دیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "میں عورتوں کے ساتھ باتیں کرتے اِدھر اُدھر ہو گئی اور گچھا وہیں پڑا رہا۔ اجیت کور نے دیکھ لیا اور مجھے ذرا غصے سے کہا کہ تم چابیاں گم کر دو گی۔ میں اپنے پاس رکھتی ہوں۔"

اگر میں آپ سے کہوں کہ مجھے اجیت کور پر شک ہے کہ رقم اُس نے

چرائی ہے تو آپ یقین نہیں کریں گی کہ بیٹی اپنے ہی گھر چوری کر سکتی ہے۔ آپ پولیس کا ریکارڈ دیکھیں۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ بعض بیٹیوں نے اپنے زیورات چرا کر انہیں دے دیئے جنہیں وہ چاہتی تھیں۔ ان لڑکیوں کے دل کہیں اور تھے اور ان کے ماں باپ ان کی شادی کہیں اور کر رہے تھے۔ ایسے تین کیسوں کی میں نے بھی تفتیش کی تھی۔

مجھے تو ہر کسی پر شک کرنا تھا۔ اس لڑکی پر میرا شک ابھی پختہ نہیں تھا۔ تاہم میں نے ذہن میں اسے شاملِ تفتیش کر لیا۔ میں کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

"تمہیں کسی پر شک ہے؟"

"نہیں" — اس نے کہا — "ہماری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔"

سکھ لڑکی اور شرمیلی؟

اسے بھیج کر میں نے اجیت کور کو بلایا۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی۔ سکھوں کی لڑکیاں شرمیلی نہیں ہوا کرتیں۔ دیہاتی سکھ ماؤں بہنوں کی موجودگی میں ننگی باتیں کرتے اور گالیاں بکتے رہتے ہیں۔ ان کا تکیۂ کلام عموماً گالیاں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کی عورتیں بھی ننگی باتیں کرتی ہیں۔ کنواری لڑکیاں بہت شوخ ہوتی ہیں اور ان میں حیا نہیں ہوا کرتی۔ اجیت کور ان سے مختلف تھی۔ اس نے دوپٹہ اس طرح اوڑھ رکھا تھا کہ ماتھا بھی ڈھکا ہوا تھا،

یعنی اُس نے دوپٹے کی بُکل مار رکھی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تھانیدار سے ڈری ہوئی تھی، لیکن اس ڈر میں شرم اور حیا صاف نظر آرہی تھی۔ اگر میں چہرہ شناسی میں غلطی نہیں کر رہا تھا تو یہ لڑکی مجھے پردہ نشین مسلمان لڑکی لگتی تھی۔

"تم نے اپنی بڑی بہن کے گھر چابیوں کا گچھا اپنی ماں سے لے لیا تھا؟"

"ہاں" — اُس نے جواب دیا — "اس نے وہاں چارپائی پر رکھا اور پرے چلی گئی تھی۔ میں نے گچھا اُٹھا لیا کہ گم نہ ہو جائے۔"

اس کے بولنے کا انداز شریفانہ تھا۔

"تم سے گھر کا کون آدمی چابیاں لے گیا تھا؟" — میں نے ہوا میں تیر چلایا۔

"کوئی بھی نہیں" — اُس نے میرا تیر ضائع کر دیا۔

"شاید تمہارا ایک بھائی چابیاں لینے آیا تھا" — میں نے ایک اور تیر چلایا۔

"نہیں تو" — وہ بولی — "دونوں بھائی کٹائی پر گئے ہوئے تھے۔ شام کو واپس آتے تھے۔"

"تم بہن کے گھر سے کہاں چلی گئی تھیں؟" — یہ بھی ہوا میں چلایا ہوا ایک تیر تھا۔

بعض سوال مشتبہ کا ردِ عمل اور چہرے کے تاثر کی تبدیلی دیکھنے کے

لئے پوچھے جاتے ہیں۔ میں نے اس لڑکی کے چہرے پر صاف تبدیلی اور آنکھوں میں بے چینی دیکھی۔ میں ابھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ تبدیلی ایک ملزم کے چہرے کی تبدیلی تھی۔ کسی پر بے بنیاد شک کا اظہار کر دو تو اس کے چہرے پر بھی ایسی ہی تبدیلی آیا کرتی ہے۔ اجیت کور نے پہلے کی طرح جواب فوراً نہ دیا۔

"میں کہیں نہیں گئی" — اس نے کہا اور ذرا اکھڑی ہوئی آواز میں کہنے لگی — "نہ جی، میں تو کہیں نہیں گئی۔ بہن کے گھر رہی تھی۔"

سے بھیج کر میں نے اس کے دونوں بھائیوں کو باری باری بلایا۔ دونوں سے نوکر اور نوکرانی کے متعلق پوچھا۔ دونوں نے کہا کہ وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتے، بہت سیدھے ہیں۔ میں نے دونوں سے کہا — "تم کٹائی چھوڑ کر گھر کیوں آئے تھے؟" — دونوں کا ردِ عمل ایک جیسا تھا۔ انہوں نے بڑے پختہ اور دو ٹوک طریقے سے کہا کہ وہ گھر نہیں آئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ گھر والے گھر کو تالے لگا کر بہن کے گھر جا رہے ہیں۔ وہ شام کو گھر آئے تھے۔

ان کے متعلق تو مجھے دوسرے ذرائع سے رپورٹ لینی تھی۔ انہیں صرف دیکھنا تھا۔ دیہاتی سکھ کے متعلق بتانا کہ یہ شریف ہے یا بدمعاش بہت مشکل ہوتا ہے۔ جیسا کہ بتا چکا ہوں، ہر سکھ گالیوں کی زبان میں بات کیا کرتا ہے۔ ہر سکھ دیسی شراب پانی کی طرح پیتا ہے۔ کسی بھی دیہاتی سکھ کو بھڑکا دو اور ہوا دے دو تو وہ پنجابی فلموں کے ہیرو اور ولن کی طرح

بڑکیں مارنے لگتا ہے۔ لہٰذہ ان دونوں بھائیوں کے متعلق میں نے کوئی رائے قائم نہ کی۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بھی کسی پر شک کا اظہار نہ کیا۔

محلّے داروں کو گرما دیا

میں نے اسی مکان کی ڈیوڑھی میں اس کے سامنے اور دائیں بائیں رہنے والے چند ایک معزز آدمیوں کو بلایا اور انہیں کہا کہ اس گھر میں چوری ہوگئی ہے۔ یہ چوری کسی گھر بھیدی نے کرائی ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، ہر گھر میں چوری کرا سکتا ہے۔ تمہارے گھروں میں کیا محفوظ رہ گیا ہے؟ اس گھر کے تالے لگے رہے اور اندر سے ڈیڑھ ہزار روپیہ نکل گیا۔ کیا یہ رقم جن بھوت لے گئے ہیں؟ چور اسی محلّے میں ہے اور تم سب کے سامنے پھر رہا ہے۔ میرے پاس کوئی جادو نہیں جس کے زور پر میں چور کو پہچان لوں گا۔ تم لوگ میری مدد کرو گے تو چور پکڑا جائے گا۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے، ورنہ سب کے گھروں سے رقمیں اور زیورات غائب ہوں گے اور میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔

"میں تم سب سے صرف ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں"—میں نے کہا—"اس گھر کے تمام افراد تین روز پہلے اپنی بیٹی کے گھر چلے گئے تھے۔ صبح سے دوپہر تک وہاں رہے۔ اس دوران کوئی آدمی یا عورت

چھت کی طرف سے یا دروازے کی طرف سے اندر آتی اور اس لیے چوری کی۔ دن کا وقت تھا۔ گلی میں کوئی نہ کوئی موجود ہوگا۔ کسی نہ کسی نے کسی کو ضرور دیکھا ہوگا۔ تم لوگ اندھے نہیں ہو۔ گھروں میں جاکر اپنی بیویوں اور اپنے بچوں سے پوچھو کہ اس روز انہوں نے کسی کو اس گھر کی کنڈی کھول کر اندر جاتے اور باہر نکلتے دیکھا ہوگا۔ اگر وہ اس گھر کا ہی کوئی فرد تھا تو بھی مجھے بتاؤ۔"

سب کو لعن طعن کرکے گھر بھیج دیا۔ انہیں فارغ کرکے میں نے نمبردار، ذیلدار اور سفید پوش سے کہا کہ وہ کوشش کریں اور میں نے جو بات معلوم کرنے کے لئے سب کو کہا ہے، اس کا سراغ وہ تینوں لگائیں۔ میں نے سکھ صوبیدار سے الگ ہوکر ان تینوں سے کہا کہ اگر اس گھر کا ہی کوئی فرد آکر چلا گیا تھا تو وہ بھی مجھے بتائیں۔ یہ تینوں چونکہ سرکاری آدمی تھے اس لئے انہیں میں نے ان کے خلاف کارروائی کی دھمکی دی اور انعام کا لالچ بھی دیا۔

ان سب کو گرمانے اور ہوا دینے سے مجھے امید تھی کہ کہیں سے کوئی سراغ مل جائے گا۔ آج کل حالات اتنے بگڑ گئے ہیں کہ لوگوں کے سامنے واردات ہوتی ہے تو کوئی گواہی دینے کے لئے سامنے نہیں آتا۔ جرائم پیشہ لوگوں کو کسی غیبی طاقت کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اب تو یہاں تک بھی ہوتا ہے کہ گواہوں کو سرعام دھمکیاں دی جاتی ہیں اور کسی نہ کسی گواہ پر قاتلانہ حملے کی خبر بھی اخباروں میں چھپ جاتی ہے۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اس وقت پولیس دیانتداری سے جرائم کی

تفتیش کرتی تھی اور لوگ تفتیش میں مدد دیتے تھے۔ گواہوں کو پولیس کا تحفظ حاصل ہوتا تھا۔ چوری چکاری کے کیسوں میں لوگ کوئی نہ کوئی سراغ لے ہی آتے تھے۔

میں صوبیدار کے نوکر اور نوکرانی کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا۔ وہاں جا کر نوکر سے صوبیدار کے مزارعوں اور دو چار دوسرے کسانوں اور مزارعوں کے نام پوچھ کر ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ ان سب کو تھانے لے آئے۔

لڑکی نارمل نہیں تھی

نوکرانی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ بہت گھبراتی ہوئی تھی۔ وہ سکھ تھی اور بیوہ۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ عمریں بارہ چودہ سال ہوں گی۔ ہمارے معاشرے کا، پولیس کا اور ہم سب کا یہ دستور ہے کہ مزارعہ، نوکر اور غریب آدمی کو ہم شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان کی قسموں اور ان کی بے گناہی کے آنسوؤں پر بھی اعتبار نہیں کرتے۔ یہ محاورہ اپنے اندر حقیقی معنی رکھتا ہے کہ مفلسی سب سے بڑا جرم ہے۔ خوشحال اور حیثیت والے لوگوں کو ہم نیک اور پاک سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی رویہ میرا تھا۔ میں نے اسے سیدھے الفاظ میں کہا کہ وہ جس گھر میں ملازم ہے، وہاں سے پیسے چوری ہو گئے ہیں۔ اگر یہ اس کا کام ہے تو صاف بتا دے اور

رقم واپس کر دے، میں اُسے بچا لوں گا۔

اُس کی حالت بہت بُری ہو گئی۔ اُس کے مُنہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی وہ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے راستے بہنے لگا۔ اس نے کہا کہ اُس نے اپنے دو بچوں کی خاطر اس گھر کی بہت خدمت کی ہے اور پوری دیانتداری سے کام کیا ہے تاکہ اس کے بچوں کو روٹی ملتی رہے۔ اُس نے اپنے خاوند کو یاد کیا اور بہت روئی۔ اُس نے کہا کہ سر کا سائیں زندہ ہوتا تو آج مجھ پر چوری کا الزام نہ لگتا۔

اگر تھانیدار جذبات میں اُلجھ جاتے تو وہ کسی بھی واردات کی تفتیش نہ کر سکے۔ اگر میں آپ کو وہ ساری باتیں سُناؤں جو اُس نے کہی تھیں تو آپ کے آنسو نکل آئیں۔ میں اُس سے متاثر ہو گیا تھا لیکن میرے سامنے ایک حقیقت تھی۔ میں اُسے حقیقت کی طرف لے آیا اور پوچھا کہ جس روز صوبیدار اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی کے گھر گیا تھا، اُس روز وہ کہاں رہی تھی۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ ساتھ والے گاؤں میں اپنی ایک بہن کے گھر چلی گئی تھی۔ اُسے چونکہ چھٹی کبھی کبھی ملا کرتی ہے اس لئے اپنی بہن سے کم ہی مل سکتی ہے۔ اُس روز اُسے موقع ملا اور وہ بچوں کو لے کر چلی گئی اور شام سے ذرا پہلے واپس آ گئی تھی۔

"تمہیں یہ تو پتہ ہو گا کہ تمہاری مالکن ٹرنکوں کی چابیاں کہاں رکھتی ہے؟"

"نہیں جی!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "مجھے بالکل علم نہیں۔"

یہ تو میں نے معلوم کر لینا تھا کہ وہ اپنی بہن کے گاؤں گئی تھی یا نہیں اور کیا وہ وہیں رہی تھی یا کچھ دیر کے لئے غائب ہو گئی تھی۔ میں نے اُس سے گھر کے بھید لینے کے لئے اُسے یہ یقین دلایا کہ مجھے اُس پر اعتبار آگیا ہے۔ میں نے اُس سے اجیت کور کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسی لڑکی ہے، اس کی عادتیں کیسی ہیں اور اُس کا کہیں میل جول ہے یا نہیں۔ نوکرانی کا یہ ڈر بجا تھا کہ اُس کے مالکوں کو پتہ چل جائے گا کہ اس نے مجھے اُن کی بیٹی کے متعلق کچھ باتیں بتائی ہیں۔ میں نے اُس کا یہ ڈر دُور کر دیا۔

میری توقع کے خلاف اُس نے اجیت کور کی بہت تعریف کی اور بتایا کہ لڑکی کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ ہے اور اُس میں نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں والی شوخی ہے ہی نہیں۔ بیاہ شادیوں پر لڑکیاں اکٹھی ہوتی اور گاتی بجاتی ہیں لیکن اجیت کور شادی والے گھر چلی تو جاتی ہے لیکن گاتی بجاتی نہیں۔ اُس کی آواز سریلی ہے مگر وہ شبد کیرتن گاتی ہے۔ بچی ہوتی روٹی کے ٹکڑے لے کر صحن میں بیٹھ جاتی یا چھت پر چلی جاتی ہے اور ٹکڑے پرندوں کو کھلاتی رہتی ہے۔ گھر میں کوئی غریب آجائے تو اُسے اپنے اچھے کپڑے بھی دے دیتی ہے۔ ماں نے اُسے دو تین بار پیٹا بھی تھا۔ اُس نے ایک عورت کو اپنے کپڑے ایک اور بھکاری کو بہت سے پیسے دے دیئے تھے۔ اُس نے اپنے بھائیوں اور باپ سے کئی بار کہا تھا کہ وہ شراب نہ پیا کریں لیکن سکھ اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا ہے شراب نہیں چھوڑ سکتا۔

نوکرانی سے میں نے کہا کہ وہ آخر جوان لڑکی ہے، کسی کو چاہتی ہوگی۔

نوکرانی نے بتایا کہ وہ شاید کسی کو چاہتی ہوگی مگر اسے کوئی نہیں چاہتا۔ اس کا نو رشتہ مانگنے بھی کوئی نہیں آتا۔ سب کہتے ہیں کہ یہ تو واہگورو کی گاتے ہے۔ اُس کی شکل وصورت پر مرنے والے تو بہت ہیں، اس کی عادتوں سے سب گھبراتے ہیں۔ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اس کے دماغ میں کوئی نقص ہے۔

نوکرانی نے اس کی عادتوں وغیرہ کی جو تفصیل بتائی، اس سے میں نے بھی یہی رائے قائم کی ابنارمل لڑکی ہے اور یہ شاید مذہبی جنون کی وجہ سے ہے۔ ایسی لڑکی کو کوئی گرہستی یا گوردوارے کا کوئی "بھائی" قبول کر سکتا تھا۔ بہرحال اجیت کور کے متعلق مجھے جو شک تھا، وہ رفع ہو گیا اور نوکرانی نے بھی اپنے خلاف شک رفع کر دیا۔ اجیت کور کے بھائیوں کے چال چلن کے خلاف اُس نے کوئی بات نہ کہی۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ دونوں بھائی اپنے ماں باپ کے فرمانبردار ہیں اور اُن کا آپس میں یا اپنے ماں باپ کے ساتھ کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔

ساتھ والے گھروں کے افراد کے متعلق اُس سے تفصیل پوچھی۔ مجھے شک تھا کہ ان میں کوئی مجرمانہ عادات کا نوجوان ہوگا یا کوئی مشکوک چال چلن کی عورت رہتی ہوگی۔ اُس نے بتایا کہ وہ سب خوشحال گھرانے ہیں اور ان میں سے کسی عورت کا صوبیدار کے گھر آنا جانا اتنا زیادہ نہیں کہ اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ فلاں ٹرنک میں رقم رکھی ہوتی ہے۔

"کوئی اور عورت بتا سکتی ہو جس کے ساتھ تمہاری مالکن کے تعلقات اتنے گہرے ہوں کہ اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ رقم اور زیورات کہاں رکھے ہیں؟"

"گاؤں کی عورتیں آتی رہتی ہیں"۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "دونوں کے ساتھ سردارنی کے تعلقات بہت گہرے ہیں لیکن میں نے کبھی کسی عورت کو اُس کمرے میں سردارنی کے ساتھ جاتے نہیں دیکھا جس میں ٹرنک رکھے ہیں۔"

یہ عورت مجھے اپنی رہائی کے لئے خوش کرنا چاہتی تھی اس لئے میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کوشش کر رہی تھی کہ میں جو پوچھوں اُس کا جواب صحیح اور مکمل دے۔ اس سے میں نے بہت کچھ پوچھا۔ صوبیدار اور اُس کی بیوی کے آپس کے تعلقات کے متعلق بھی پوچھا۔ وہ بتاتی رہی۔ میں نے اس عورت کو بہت دیر اپنے ساتھ رکھا اور مجھے یقین آگیا کہ اس کا اگر کوئی جُرم ہے تو وہ صرف مفلسی اور بیوگی ہے اور یہ کہ وہ دو بچوں کی ماں ہے۔

اُسے میں نے چُھٹی دے دی اور ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اس عورت کی بہن کے گاؤں جائے اور نمبردار کو ساتھ لے کر معلوم کرے کہ یہ فلاں دن اپنی بہن کے ہاں گئی تھی۔ کیا واقعی گئی تھی؟ کتنی دیر وہاں رہی تھی؟ کیا اس دوران کہیں چلی گئی تھی؟

ایک خوبصورت اور چالاک عورت

چار پانچ مزارعے آگئے۔ صوبیدار کا نوکر بھی تھا۔ میں نے پہلے اُسے بُلایا اور اُسے بھی نوکرانی کی طرح کہا کہ اگر چوری اُس نے کی ہے تو رقم

واپس کر دے، اُسے بچا لوں گا۔ اُس کا ردِ عمل بھی نوکرانی جیسا تھا۔ مجھے اُس کے چہرے پر اور اُس کے انداز میں جرم نظر نہیں آ رہا تھا لیکن بعض نہایت شریف آدمی بھی اپنے سامنے رقم پڑی دیکھ کر جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ اس نوکر نے بھی رو کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کی۔
میں نے اُسے بہت ڈرایا دھمکایا اور اُسے خبردار کیا کہ اُس پر جو تشدد کیا جائے گا، اس کے تصور سے ہی وہ بے ہوش ہو جائے گا مگر وہ ہاتھ جوڑے ہوئے منت سماجت کرتا اور ہچکیاں لے لے کے روتا رہا۔
میں نے اُس سے دوسری باتیں معلوم کرنے کے لئے اُسے سنبھالا دینا چاہا، تسلی دلاسہ دیا مگر وہ اور زیادہ رونے لگا۔ میں تھکا ہوا تھا اور ابھی تک کوئی کھرا کھوج میرے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اس کے ساتھ میں نے گرج کر کہا ——"چپ ہو جا"—— یوں لگا جیسے کھڑے کھڑے اُس کی جان نکل گئی ہو۔ ایک ہاتھ اپنے گال پر رکھ کر وہ بت بن گیا۔
ایک سکھ کانسٹیبل کو بلا کر اُسے کہا کہ اسے پانی پلاؤ۔ وہ پانی پی چکا تو میں نے اُسے کہا کہ اگر وہ بے گناہ ہے تو میں جو پوچھتا ہوں، وہ سچ سچ بتا دے، ورنہ ہڈیاں توڑ دوں گا۔ ایک ہی تھپڑ اُسے ٹھکانے لے آیا تھا۔ کچھ اور جھک جھک کر کے میں نے اُس کا ڈر دُور کیا۔ بڑی لمبی پوچھ گچھ سے اُس نے جو کچھ بتایا وہ نوکرانی کے بیان کی تائید تھا۔ اجیت کور کے متعلق اُس نے وہی بتایا جو نوکرانی نے بتایا تھا۔

"جس روز یہ لوگ اپنی بڑی بیٹی کے گھر چلے گئے تھے، اُس روز تم نے دن کہاں گزارا تھا؟"

"کٹائی میں" — اُس نے جواب دیا — "کٹائی میں تو ہر کسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دنوں مجھے کھیتوں میں بلا لیتے ہیں۔"

"سوچو اور اچھی طرح یاد کر کے مجھے بتاؤ کہ اُس روز دونوں بھائیوں میں سے کوئی ایک کچھ دیر کے لئے گھر آیا تھا؟"

اُس نے سوچ سوچ کر بتایا کہ وہ کٹائی میں لگا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا نہیں۔ دونوں بھائی بھی کٹائی کر رہے تھے۔

"اب مجھے بالکل صحیح بتاؤ کہ دونوں بھائیوں کا چال چلن اور عادتیں کیسی ہیں؟"

وہ پھر گھبرا گیا اور ہاتھ جوڑ کر اُس نے منت کے لہجے میں کہا —

"میں ان کا نوکر ہوں مہاراج جی! انہیں پتہ چل گیا تو مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔"

میں نے اُسے حوصلہ دیا اور یقین دلایا کہ اُس کے مالکوں کو پتہ نہیں چلے گا کہ اُس نے کچھ بتایا ہے۔ اُس نے جو انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ دونوں بھائیوں میں اور تو کوئی بُری عادت نہیں، البتہ بڑے بھائی کا دوستانہ ایک ہندو عورت کے ساتھ ہے۔ وہ بہت خوبصورت عورت ہے اور بڑی چالاک ہے۔ نوکر نے بتایا کہ وہ ان کے پیغام ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے۔ اُس نے یہ راز فاش کیا کہ یہ عورت پیسے مانگتی رہتی ہے۔

"عموماً کتنی رقم مانگتی ہے؟"

"کبھی پندرہ روپے کبھی بیس روپے" — اُس نے جواب دیا۔

"اور بڑا بھائی اُسے روپے دے دیتا ہے؟"

"ہر بار دے دیتا ہے۔"

"پچھلے دنوں اس عورت نے زیادہ رقم نہیں مانگی تھی؟"

"مانگی تو نہیں تھی لیکن مجھے ایک شک ہے" — اُس نے جواب دیا — "یہ عورت شادی شدہ ہے۔ اُس نے اپنی چھوٹی بہن کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے کیونکہ ان کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ یہ عورت بہن کی شادی کی فکر میں رہتی ہے۔ وہ سنت سنگھ (صوبیدار کا بڑا بیٹا) سے ضرور مدد مانگے گی یا مانگ چکی ہو گی۔"

نوکر میری حوصلہ افزائی سے اب عقل کی باتیں کرنے پر آگیا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے کس طرح محسوس کیا ہے کہ اس عورت نے سنت سنگھ سے رقم مانگی ہو گی یا مانگے گی؟ — اُس نے بتایا کہ وہ تین سال سے اُن کے درمیان آیا ہوا ہے۔ اُس نے عورت کی کچھ باتیں سنائیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سنت سنگھ کی کھال اُتار رہی ہے۔

نوکر نے یاد کر کے کہا — "پچھلے سال کٹائی کے بعد اس عورت نے مجھے کہا تھا کہ سنتے سے کہنا کہ سنار نے انگوٹھی تیار کر دی ہے.... میں نے سنت سنگھ سے کہہ دیا۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ دو تین روز بعد سنت سنگھ نے مجھے کپڑے میں بندھی ہوئی ایک چیز دے کر کہا کہ اُسے دے دینا۔

میں نے لے جاتے ہوئے کھول کر دیکھا۔ یہ سونے کی انگوٹھی تھی۔"

"کیا یہ عورت صوبیدار کے گھر آتی رہتی ہے؟"

"آتی ہے" — نوکر نے جواب دیا — "لیکن سردارنی اسے پسند نہیں کرتی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ٹال دیتی ہے۔"

"گاؤں والوں کو ان کی دوستی کا علم ہے؟"

"کتی لوگ جانتے ہیں۔"

"سنت سنگھ کے باپ کو بھی معلوم ہے؟"

"شاید اُسے معلوم نہیں" — نوکر نے جواب دیا — "اگر صوبیدار کو پتہ چل جائے تو بیٹے کی ہڈیاں توڑ دے۔"

اس سلسلے میں مَیں نے نوکر سے جو معلومات حاصل کرنی تھیں کر لیں اور اُسے سختی سے کہہ دیا کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ میں اُس سے کیا پوچھتا رہا ہوں اور اُس نے مجھے کیا بتایا ہے۔

مُردوں کو انگلیوں پہ نچا لیتی ہے

مزارعوں کو اکیلے اکیلے بلایا۔ ان سے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ صوبیدار اپنے کُنبے کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی کے گھر چلا گیا تھا تو اس دوران دونوں بھائیوں میں سے کوئی کتنا تی سے غیر حاضر ہوا تھا؟ — اب نوکر مجھ پہ بڑا قیمتی انکشاف کر گیا تھا، اس لئے میرے لئے یہ

معلوم کرنا کہ بڑا بھائی سنت سنگھ کتائی سے غیر حاضر ہوا تھا یا نہیں، زیادہ ضروری ہو گیا تھا — اور اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ چور اسی گھر میں ہے اور چوری اُسی روز ہوئی ہے جس روز گھر والے تالے لگا کر گئے تھے۔

یہ غریب لوگ تھانیدار اور اُس کے تھانے سے بھی ڈرتے تھے اور اپنے مالکوں سے بھی۔ کھل کر بات کرتے گھبراتے تھے۔ ان میں سے صرف ایک نے بتایا کہ سنت سنگھ کتائی چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ اُس کے اندازے کے مطابق وہ ڈیڑھ گھنٹہ غائب رہا تھا۔

وہ دن اسی میں گزر گیا۔ رات کو نمبردار میرے گھر آیا۔ وہ صرف یہ بتانے آیا تھا کہ وہ سراغرسانی میں مصروف ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آجائے۔ میں نے اُس سے سنت سنگھ اور ہندو عورت کے متعلق پوچھا۔ اُس نے نوکر کے بیان کی تصدیق کی۔ اس عورت کے متعلق اُس نے بتایا کہ اُس کا خاوند بڈھا اور شریف آدمی ہے۔ گاؤں میں اُس کی چھوٹی سی دکان ہے۔ اُس نے اپنی بیوی پر یہ احسان کر رکھا ہے کہ اس کی چھوٹی بہن کو اپنے گھر رکھ لیا ہے۔ بہن شریف لڑکی ہے لیکن بڑی بہن کا چلن اچھا نہیں۔ وہ اتنی بُری بھی نہیں کہ ہر کسی کے ساتھ دوستی لگاتی پھرے۔ مردوں کو انگلیوں پر نچا لیتی ہے۔ سنت سنگھ کے ساتھ اُس کی مستقل دوستی ہے۔

نمبردار ہندو تھا اس لئے میں اُسے سنت سنگھ کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔ یہ میرا تجربہ تھا کہ سکھ نمبردار سکھوں کی بہت مدد کیا کرتے تھے۔

کوئی سکھ جرم کر بیٹھتا تو سکھ نمبر دار اُسے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔

میں نے اس ہندو نمبر دار سے کہا کہ کوئی شریف ہے یا بدمعاش، مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میری دلچسپی اس کیس کے ساتھ ہے جو میں رجسٹر کر کے بیٹھا ہوں۔ میری توجہ اب سنت سنگھ پر آگئی ہے۔ اُس کے پاس تالوں کی دوسری چابیاں تھیں جو اُس نے اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ اس کے ماں باپ اور بہن گھر کو تالے لگا کر گئے تو سنت سنگھ نے آ کر تالے کھولے۔ ٹرنک کے تالے کی دوسری چابی نہیں تھی۔ چنانچہ اُس نے پیچھے سے قبضے اکھاڑ کر ڈھکنا اٹھالیا اور رقم لے گیا۔ اُس نے یہ رقم اس ہندو عورت کو دی ہے۔ اُس نے اپنی بہن کی شادی کے لئے مانگی ہو گی۔

نمبر دار نے وثوق سے کہا کہ صوبیدار کے دونوں بیٹوں میں اور کوئی عیب نہیں، البتہ سنت سنگھ اس عورت کے چکر میں آیا ہوا ہے۔

میں نے نمبر دار کو کچھ معلومات لانے کے لئے کہا اور اُسے دو تین ڈھنگ بھی بتائے۔ میرے ذہن سے اجیت کور نکل چکی تھی۔ اب شک کا مرکز اُس کا بھائی سنت سنگھ تھا۔ پھر بھی میں نے نمبر دار سے اجیت کور کے متعلق پوچھا۔

"اس لڑکی کی وجہ سے اس کا بڑا بھائی اس ہندو عورت کے چکر میں آگیا ہے"۔۔۔ نمبر دار نے کہا۔ میں نے حیران سا ہو کے نمبر دار کی طرف دیکھا کہ یہ کوئی انکشاف ہو گا۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "صوبیدار پہلے اجیت کور کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد دونوں بیٹوں کی شادی اکٹھی کر دے گا۔

بھائی بھی یہی کہتے پھرتے ہیں کہ وہ بہن کو رخصت کر کے شادی کریں گے مگر بہن کا رشتہ لینے کوئی نہیں آتا۔ یہ لڑکی ظاہری طور پہ تو مذہب کی سخت پابند ہے لیکن اس میں کوئی دماغی نقص ہے۔ شاید وہ کوئی رشتہ قبول بھی نہیں کر رہی۔ مجھے ایسے نظر آرہا ہے کہ یہ لڑکی گھر سے بھاگ جائے گی اور سیدھی امرتسر دربار پہنچے گی۔ اسے بالکل احساس نہیں کہ وہ خوبصورت اور نوجوان لڑکی ہے اور اسے اگر کسی ریاست کا مہاراجہ دیکھ لے تو ہیروں کے عوض بیاہ کر لے جائے۔ نہ اس کی شادی ہوتی ہے نہ ماں باپ اپنے بیٹوں کا کوئی بندوبست کرتے ہیں۔ بڑا بیٹا سنت سنگھ ایک نوسرباز عورت کے جال میں پھنس گیا ہے۔"

میں نے بھی اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں بھی کی تھیں۔ مجھے ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا کہ یہ لڑکی ذہنی مریض ہے۔ میں نے صرف یہ دیکھا تھا کہ لڑکی مذہب کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے اور میں نے اپنے آپ سے کہا تھا کہ اسے سکھوں کے گھر میں پیدا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ بہرحال اب اس سے میری توجہ ہٹ گئی تھی۔

پیلا رومال، لال ست سری اکال

دوسرے دن میں کسی اور کیس میں مصروف ہو گیا۔ اس گاؤں کے ایک مسلمان نوجوان نے ایک ہندو پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اسے گرفتار

کر کے ہم نے جوڈیشل حوالات میں بھیج دیا تھا۔ ہندو کا بیان تھا کہ اُس نے اُسے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ گواہیاں ایسی لائی گئی تھیں کہ کیس بہت مضبوط ہو گیا تھا۔ میں خود چند ایک کیسوں میں اُلجھا ہوا تھا اس لئے میں نے اس مسلمان کا کیس اے۔ ایس۔ آئی رگھبیر سنگھ کے سپرد کر دیا تھا۔ رگھبیر سنگھ ہندو راجپوت تھا۔ کیس آسان تھا۔ تفتیش میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ ہندو خود ہی شہادت فراہم کر رہا تھا۔ مسلمان یعنی ملزم کے وکیل نے اُس کی ضمانت کے لئے درخواست دی تھی جو مجسٹریٹ نے مسترد کر دی تھی۔ جُرم کی نوعیت ایسی تھی کہ میں خود بھی اس کوشش میں تھا کہ ملزم کی ابھی ضمانت نہ ہو۔ رگھبیر سنگھ سے میں نے کہہ رکھا تھا کہ ضمانت نہ ہونے دینا، مگر مجھے پتہ چلا کہ ملزم ضمانت پر رہا ہو گیا ہے۔

رگھبیر سنگھ کورٹ سے آیا تو اُس نے بتایا کہ ملزم کا پہلا وکیل بہت کمزور اور نالائق تھا۔ اب اُس نے بڑا اچھا وکیل کر لیا ہے۔ ملزم غریب آدمی تھا۔ اس نے جُرم بڑا سنگین کیا تھا۔ غربت کی وجہ سے وہ کوئی قابل وکیل نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے جُرم بھی غُربت کی وجہ سے ہی کیا تھا لیکن اُس کی دلیری کا یہ عالم تھا کہ تھانے میں اُسے لایا گیا تو ہم سب کو للکارتا تھا۔ جس ہندو کو اُس نے زخمی کیا تھا، اُس پر لٹوٹٹ پڑتا اور نعرے لگاتا تھا — ”سچے کی مدد خدا کرے گا۔“

دس بارہ ہندو تھانے میں آگئے تھے۔ ان میں عینی شاہد بھی تھے۔ ملزم کی زبان بند نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے کہیں اور جانا تھا۔ میں کیس

رگھبیر سنگھ کے حوالے کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد رگھبیر سنگھ اس کیس کی جو کارگزاری اور ڈائری میرے آگے رکھتا رہا، میں اس پر دستخط کرتا رہا۔

اُس روز جب اے۔ ایس۔ آئی رگھبیر سنگھ نے عدالت سے آکر بتایا کہ ملزم ضمانت پر رہا ہو گیا ہے تو مجھے غصہ آگیا۔ ضمانت سیشن کورٹ سے ہوئی تھی۔ رگھبیر سنگھ بھی کورٹ میں گیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس نے سرکاری وکیل کو بتایا نہیں ہوگا کہ ملزم کی ضمانت نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ ضمانت رُکوا سکتا تھا۔ رگھبیر سنگھ بار بار کہتا تھا کہ ملزم نے ایک مہنگا اور قابل وکیل کر لیا ہے۔

ہم دونوں برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ رگھبیر سنگھ نے جیب سے رومال نکالا اور چہرے سے پسینہ صاف کیا۔ میں نے اتفاق سے دیکھا اور میں چونک پڑا۔ رومال ریشمی تھا اور اس کا رنگ پیلا تھا۔ اس کے درمیان مجھے لال کڑھائی نظر آئی۔ میں نے مذاق کے انداز سے کہا ––– "رگھبیر یار! یہ ریشمی رومال کسی معشوق نے دیا ہے؟"

میں نے اُس کے ہاتھ سے ہنستے ہنستے رومال لے لیا۔ رومال کے درمیان لال دھاگے سے گورمکھی میں "ست سری اکال" کاڑھا ہُوا تھا۔ میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ صوبیدار کی بیوی نے میرے پوچھنے پر مجھے بتایا تھا کہ رقم جو چوری ہوئی ہے وہ پیلے رنگ کے ریشمی رومال میں بندھی ہوئی ہے۔ اُس نے مجھے ایک اور نشانی یہ بتائی تھی کہ اس کے درمیان لال دھاگے سے گورمکھی میں "ست سری اکال" کاڑھا ہُوا ہے۔ مجھے معلوم

نہیں تھا کہ وہ بھی رومال تھا۔ میں نے پہلے تو یہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ یہ وہی رومال ہے۔ ایسے رومال بازار میں تو نہیں بکتے تھے کہ بہت سے لوگوں کے پاس ہوتے۔

اس کی شناخت صوبیدار کی بیوی اور بیٹی کر سکتی تھی۔ میں نے شناخت کا انتظار نہ کیا۔ رومال ہاتھ میں لئے میں کانسٹیبلوں کے کمرے میں چلا گیا اور ایک کانسٹیبل سے کہا کہ صوبیدار، اُس کی بیوی اور اُس کی بیٹی کو ساتھ لے آؤ۔

راز اُس رومال کا

"رگھبیر!" میں نے برآمدے میں آکر رگھبیر سنگھ کے سامنے بیٹھتے ہُوئے پوچھا — "یہ رومال تمہارے پاس کس طرح آیا ہے؟"

اُس نے رومال میرے ہاتھ سے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور شگفتہ لہجے میں بولا — "ایک سکھنی کی نشانی ہے ملک صاحب!"

"رگھبیر سنگھ!" میں نے کہا — "میں مذاق نہیں کر رہا۔ اس سے پہلے کہ یہ رومال کوئی اور آکر شناخت کرے، مجھے بتا دو کہ یہ تمہارے پاس کس طرح آیا ہے"

"ملک صاحب؟" — اُس نے حیران سا ہو کے پوچھا — "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"میں جو پوچھتا ہوں مجھے وہ بتاؤ" — میں نے ذرا دبدبے سے کہا — "مجھے جانتے ہو میں کیسا آدمی ہوں۔ میں تمہیں ابھی حوالات میں حاضر کرا دوں گا۔ اس کے بعد سیدھے جیل جاؤ گے۔ مجھ سے کسی رعایت یا مدد کی توقع نہ رکھنا۔"

"اپنے ایک دوست کی جیب سے نکال لایا ہوں" — اُس نے کہا۔

"اُس کا نام؟ پورا پتہ؟" — میں نے کہا — "ابھی اُسے تھانے میں بلاؤ۔"

"ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "کچھ سمجھاؤ تو سہی۔ میں بتا دوں گا رومال کہاں سے آیا ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ یہ کیسا رومال ہے؟"

"جانتے ہو میں کل سے ایک چوری کی تفتیش کر رہا ہوں؟"

"ہاں جانتا ہوں" — اُس نے کہا — "آپ ارجن پور کی بات کر رہے ہیں نا! ایک پنشنر سکھ صوبیدار کے گھر چوری ہوئی ہے۔"

"ہاں!" — میں نے کہا — "رقم اس رومال میں بندھی ہوئی ٹرنک میں رکھی تھی۔"

"آپ نے یہ رومال پہلے دیکھا تھا؟" — اُس نے پوچھا۔

"نہیں" — میں نے جواب دیا — "میں نے بتائی ہوئی نشانیوں سے پہچانا ہے۔ اسے شناخت کرنے والے آ رہے ہیں۔ تم نے کہا ہے کہ یہ ایک سکھنی کی نشانی ہے؟ اجیت کور کی بات کر رہے ہو؟"

"اجیت کور؟" — اُس نے ہنس کر پوچھا — "میں کسی اجیت کور کو نہیں جانتا۔ وہ تو میں نے مذاق کیا تھا" — اُس نے ذرا رُک کر اور لمبا سانس لے کر کہا — "میں آپ کو زیادہ چکر نہیں دوں گا۔ آپ میرے صرف افسر ہی نہیں، آپ خاندانی آدمی ہیں۔ میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے۔ میں نے آپ جیسا...."

میں نے غصے میں ایک بڑا ہی گندہ لفظ استعمال کر کے کہا — "مجھے بنانے کی کوشش نہ کرو رگھبیرا تم جانتے ہو مجھے خوشامد سے نفرت ہے۔ سیدھی بات کرو۔ میری عزت کرنا چاہتے ہو تو بعد میں کر لینا۔ فوراً بتا دو کہ یہ رومال تمہارے پاس کس طرح آیا۔"

میں اُس پر سوار تو ہو گیا تھا لیکن یہ سوچ کر مجھے اپنے اندر یہ ڈر محسوس ہوا کہ صوبیدار کی بیوی اور بیٹی نے کہہ دیا کہ یہ وہ رومال نہیں جس میں رقم بندھی ہوئی تھی تو اپنے اے۔ ایس۔ آئی کے سامنے میری کیا عزت رہے گی۔

"بتانے سے پہلے میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر عرض کروں گا کہ آپ کو میرا ایک گناہ بخشنا پڑے گا" — اُس نے کہا۔

"پہلے بات کرو۔"

"میں نے ملزم کو ضمانت پر رہا ہونے میں مدد دی ہے" — اُس نے مسلمان ملزم کے متعلق بتایا جسے میں چاہتا تھا کہ ابھی ضمانت پر رہا نہ ہو۔ اُس نے کہا — "میں نے پی۔ پی (پبلک پراسیکیوٹر) سے کہہ دیا تھا کہ اس

کی ضمانت کی درخواست کی مخالفت نہ کرنا۔ میں نے ملزم کے بھائی سے پانچ سو روپیہ لیا ہے۔ اُس نے یہ رقم اس رومال میں لپیٹ رکھی تھی۔ مجھے رومال اچھا لگا تو میں نے اُس سے رومال بھی لے لیا۔ ملزم کا بھائی مجھے بہت دنوں سے کہہ رہا تھا کہ میں اُس کی مدد کروں۔ میں نے اُس سے پانچ سو روپے مانگے تھے۔ یہ رقم اُس نے مجھے آج سیشن کورٹ کے باہر دی ہے.... اب مجھے خیال آتا ہے کہ اس سے پہلے وہ اپنے بھائی کے لئے اتنا اچھا وکیل کیوں نہیں کر سکا تھا۔ اُس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اب تین چار دنوں سے اسی غریب آدمی نے مجھے صاف کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں اُس کے بھائی کو ضمانت پر رہا کرانے کا کیا لوں گا۔ میں نے اُسے پانچ سو روپیہ اس لئے کہا تھا کہ وہ اتنی رقم نہیں لا سکے گا اور میرے پیچھے پھرنا چھوڑ دے گا لیکن وہ رقم لے آیا اور اُس نے مہنگا اور اچھا وکیل بھی کر لیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس نے کہیں ہاتھ مارا ہے اور اُس کا ہاتھ صوبیدار کے گھر پڑا ہے۔ میں گواہ ہوں۔ آپ اُسے بلا لیں۔"

راز کی ایک اور بات

یہ تو بعد کا مسئلہ تھا کہ رشوت خوری کے الزام میں مجھے اے۔ایس۔آئی رگھبیر سنگھ کے ساتھ کیا سلوک کرنا تھا، مجھے چوری کی واردات کا جو ملزم

مِل رہا تھا، اُس کی طرف فوری توجہ دینی تھی۔ میں نے ہمیشہ خدا سے مدد مانگی ہے اور خدا نے میری مدد کی ہے۔ میں صوبیدار، اُس کی بیوی اور اُس کی بیٹی کا انتظار کر رہا تھا۔ دو اڑھائی میل دُور سے آتے کچھ وقت درکار تھا۔ مجھے اُس گاؤں کا ذیلدار آتا نظر آیا۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی تھا۔ وہ ضرور کوئی خبر لایا تھا۔ میں اُسے آتا دیکھ کر برآمدے سے اُٹھا اور اپنے دفتر میں چلا گیا۔ ذیلدار اندر آگیا۔ میں اُسی کے لئے اندر گیا تھا۔

"ایک خبر لایا ہوں" — اُس نے کہا — "آپ نے کہا تھا کہ جس وقت صوبیدار، اُس کی بیوی اور بیٹی اپنی بڑی بیٹی کے گھر گئے ہوئے تھے، اُس وقت کوئی آدمی یا کوئی عورت ان کے گھر میں آئی اور اُس نے چوری کی۔ میں کل سے سراغ لگا رہا ہوں۔ آج صبح اس آدمی نے جو میرے ساتھ آیا ہے، بتایا ہے کہ صوبیدار کی بیٹی اجیت کور کو اُس نے اپنے مکان کے باہر والے دروازے کی زنجیر کھولتے اور اندر جاتے دیکھا تھا۔ گھر کے اپنے کسی فرد کا اپنے گھر میں داخل ہونا کوئی جُرم یا عجوبہ نہیں تھا۔ کسی اور نے بھی اجیت کور کو اپنے گھر میں جاتے دیکھا ہو گا لیکن یہ اُس کا اپنا گھر تھا اس لئے کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں معلوم کرتا رہا۔ آخر اس آدمی نے مجھے اجیت کور کے متعلق بتایا۔"

میں نے اس آدمی کو اندر بلا کر پوچھا تو اُس نے کہا کہ اُس نے اجیت کور کو زنجیر کھول کر اندر جاتے دیکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے

کہا کہ وہ آگے نکل گیا تھا اس لئے اُس نے لڑکی کو باہر آتے نہیں دیکھا۔

میری دلچسپی سنت سنگھ کے ساتھ تھی۔ میں یہ سُننا چاہتا تھا کہ سنت سنگھ اپنے گھر والوں کی غیر حاضری میں اپنے گھر میں داخل ہُوا تھا۔ بہر حال اب رگھبیر سنگھ اور پیلے رومال نے میرا کام کچھ آسان کر دیا تھا۔ میں نے اپنے اعتماد کے لئے ایک کانسٹیبل کو گاؤں سے اُس آدمی کو ساتھ لانے کو بھیج دیا جس سے رگھبیر سنگھ نے رشوت لی تھی۔ ذیلدار اور اُس کے ساتھ کے آدمی کو میں نے باہر بیٹھنے کو کہا۔ وہ باہر نکلے ہی تھے کہ رگھبیر سنگھ اندر آ گیا۔ وہ میرے کردار اور میری کارروائیوں سے واقف تھا۔ پیلے رومال نے اُسے پھندے میں پھانس لیا تھا۔ میں اُسے رشوت خوری معاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رشوت تو چلتی ہی تھی لیکن اُس نے میرے کہنے کے باوجود ملزم کو ضمانت پر رہا ہونے میں مدد دی تھی۔

"ملک صاحب!" — رگھبیر سنگھ نے مُسکرا کر منت کی — "میری غلطی تو آپ معاف کر دیں گے نا!"

"پہلے مجھے اس تفتیش سے فارغ ہو لینے دو" — میں نے ایسے لہجے میں کہا جس میں بے رُخی اور کچھ حقارت بھی تھی۔ میں نے کہا — "اگر میرا سٹاف مجھے اس طرح دھوکے دینے لگے جس طرح تم نے دیا ہے تو میں استعفیٰ دے کر گھر چلا جاتا ہوں۔ جاؤ، باہر بیٹھو!"

وہ بہت ہی ڈر گیا تھا۔ میرے سامنے سے اُٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے دھتکارا تو بھی بیٹھا رہا۔

"آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کو راز کی ایک اور بات بتا دیتا ہوں" — اُس نے کہا — "آپ جس ملزم کو اتنا خطرناک سمجھتے ہیں کہ اُسے ضمانت پر رہا نہیں ہونے دے رہے تھے، وہ اتنا خطرناک نہیں اور نہ ہی یہ ۳۰۷ کا کیس ہے۔ بشیرے (مسلمان ملزم) کی اس ہندو کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی۔ یہ لڑائی کسی لڑکی پر ہوئی تھی۔ ہندو جو زخمی ہوا تھا، وہ بشیرے کو مارنا پیٹنا چاہتا تھا مگر بشیرا اُس سے طاقتور تھا۔ اُس نے ہندو کو پیٹ ڈالا۔ گاؤں کے چار پانچ ہندوؤں نے بشیرے کے خلاف یہ پرچہ کرا دیا کہ اس نے اس ہندو پر قاتلانہ حملہ کیا ہے اور اس کی جیب سے رقم نکالنے کی کوشش کی ہے۔ بشیرے نے تھانے میں آکر ہم سب کو للکارا اور گالیاں جو دی تھیں، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ غنڈہ اور دلیر ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ سچا ہے۔ ہندو گواہوں نے اور میں نے اُسے اصل بات کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ آپ اُس کے رویّے سے اُس کے خلاف ہو گئے۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں کہ یہ لڑکی کا کیا چکر تھا اور لڑکی کون تھی۔"

"یہ تو تمہارا دوسرا جرم ہے جو تم مجھے سنا رہے ہو" — میں نے کہا — "میں نے مصروفیت کی وجہ سے یہ کیس تمہارے حوالے کر دیا تھا۔"

"دیکھو ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "میں آپ کو راز کی کیسی کیسی باتیں بتا رہا ہوں اور آپ کا غصہ ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا۔"

میرا غصہ واقعی ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔ ہندو تو اس انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی مسلمان ماتحت ذرا سی غلطی کرے تو اسے بہت بڑی غلطی بنا کر اُسے سزا

دلاتی جاتے۔

اجیت کور نے رومال پہچان لیا

صوبیدار، اس کی بیوی اور اجیت کور آگئے۔ صوبیدار کا بڑا بیٹا سنت سنگھ بھی ساتھ تھا۔ اسے ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے باپ، اس کی ماں اور اس کی بہن کو تھانے بلایا گیا تھا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ میں نے سنت سنگھ کو باہر بیٹھنے کو کہا۔ اسے میں ابھی تک مشتبہ سمجھتا تھا۔ اس کی ماں اور بہن کو رومال دکھایا تو ماں نے بے تابی سے کہا — "یہ ہمارا رومال ہے۔ رقم اسی میں تھی"۔

"ماں بیٹی ایک بار پھر دیکھ لو" — میں نے کہا — "اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ"۔

اجیت کور نے رومال کو پھیلا کر دیکھا اور بولی — "یہ ہمارا ہی رومال ہے۔ سنت سری اکال میرے ہاتھ کا کاڑھا ہوا ہے۔ مجھے غلطی نہیں لگ سکتی"۔

غلطی واقعی نہیں لگ سکتی تھی۔ رومال کی حالت بتا رہی تھی کہ اس میں کوئی چیز بندھی رہی ہے۔ کناروں پر گانٹھوں کی سلوٹیں ابھی موجود تھیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کسی تجربہ کار سراغرساں کی ضرورت نہیں تھی۔ دس دس اور پانچ پانچ روپے کے نوٹوں کی گٹھی جس رومال میں کئی مہینے بندھی رہے، اسے آپ کھولیں تو کوئی بھی اسے دیکھے تو کہے گا کہ اس

ہیں کچھ بندھا رہا ہے۔ اسے جب تک تر کر کے استری نہ کریں، سلوٹیں غائب نہیں ہوتیں۔

میں اب تفتیش کے اُس مقام پر آگیا تھا جہاں ذراسی بھول چوک تفتیش کو چوپٹ کر سکتی تھی۔ مجھے اب یہ سوچنا تھا کہ کسے پہلے پوچھ گچھ کی چکی میں ڈالوں۔ میرے سامنے ایک سوال یہ تھا کہ اجیت کور اپنے ماں باپ کی غیر حاضری میں اپنے گھر آتی تھی تو کیا وہ یہ رقم چوری کرنے آتی تھی؟ — نہیں۔ وہ مذہب پرست لڑکی تھی۔ اس قدر مذہب پرست کہ لوگ اسے پاگل کہتے تھے اور اُس نے ریشمی رومال میں پھول کاڑھنے کی بجائے ست سری اکال کاڑھا تھا۔

میرے سامنے رگھبیر سنگھ کا یہ انکشاف آگیا کہ بشیرے اور زخمی ہندو میں کسی لڑکی پر لڑائی جھگڑا ہوا تھا۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ لڑکی کون ہے۔ میں اب سوچ میں پڑ گیا کہ یہ لڑکی کیا اجیت کور ہو سکتی ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اجیت کور نے اپنے گھر سے رقم چُرا کر بشیرے کے بھائی کو دی ہو کہ اچھا وکیل کرو اور بشیرے کی ضمانت کرا لو؟ — نہیں۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ اجیت کور اتنی چالاک نہیں تھی۔ مذہب میں ڈوبی ہوئی یہ لڑکی ایک مسلمان کے ساتھ پاک یا ناپاک تعلق نہیں رکھ سکتی تھی۔ چوری کا ملزم سنت سنگھ تھا یا بشیرے کا بھائی۔ لہٰذہ میں نے سوچ سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ بشیرے کو بھی تھانے بلایا جاتے۔ اس کے بھائی کو تھانے لانے کے لئے ایک کانسٹیبل چلا گیا تھا۔ میں نے ایک اور کانسٹیبل کو بشیرے

کو ساتھ لانے کے لئے بھیج دیا۔

اجیت کور اور بشیرے کا تعلق کیا ہے؟

بشیرے کا بھائی پہلے آ گیا۔ میں نے اُسے اپنے دفتر میں بٹھا لیا۔ وہ بہت ہی گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اُس کی گھبراہٹ دُور کرنے کی کوشش نہ کی، بلکہ گھبراہٹ میں اضافہ کر دیا۔ میں اُس کے اعصاب توڑ کر اس کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا۔

"یہ رومال تمہارے پاس تھا" — میں نے رومال اُس کے آگے پھیلا کر رکھتے ہوئے کہا — "یہ تم نے کہاں سے لیا ہے؟"

"یہ میرا اپنا ہے" — اُس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ زبان اُس کے قابو میں نہیں تھی۔

"تم سکھ ہو یا مسلمان؟"

"مسلمان ہوں" — اُس نے جواب دیا۔

"لیکن اس رومال پر ست سری اکال کاڑھا ہوا ہے" — میں نے کہا — "یہ تمہاری بیوی نے کاڑھا تھا؟ ماں نے یا بہن نے؟"

اُس کا سانولا رنگ لاش کی طرح ہو گیا اور وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ میں نے اُس کے کندھے پر بڑی زور سے ہاتھ رکھا۔ وہ بُری طرح بدکا۔ شاید یہی میرا ملزم تھا۔

"میں کوئی سوال جواب نہیں کروں گا"— میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا — "یہ رومال تمہارا نہیں۔ تم نے چھوٹے تھانیدار کو پانچ سَو روپیہ دیا اور اُس نے تم سے یہ رومال بھی لے لیا۔ اس رومال میں ڈیڑھ ہزار روپیہ اور بندھا ہُوا تھا... باقی رقم کہاں ہے؟"

اُس کا مُنہ کھل گیا۔ آنکھیں ٹھہر گئیں اور زبان ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ جس صورتِ حال میں پھنس گیا تھا، اس میں انسان کا ردِّ عمل یہی ہوتا ہے۔ دماغ ماؤف اور جسم کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔

اُس کی مونچھیں لمبی اور گھنی تھیں۔ میں نے اُس کی ایک مونچھ پکڑ کر کھینچی اور کہا — "فوراً بولو ورنہ مونچھوں کے ساتھ رسّی باندھ کر چھت کے ساتھ لٹکا دوں گا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن کی رقم چوری ہوتی ہے اور جن کا یہ رومال ہے وہ باہر بیٹھے ہوتے ہیں۔ میں نے تمہیں خواہ مخواہ نہیں بلا لیا۔"

اُس کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اب مجھے زیادہ محنت یا مار کٹائی کی ضرورت نہیں تھی۔ اب ضرورت یہ تھی کہ اُسے ڈوبنے سے بچا لوں۔ یہ ایک خاص طریقہ ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ مَیں نے اُس کو تھام کر سہارا دیا اور وہ پھٹ پڑا۔

"مجھے یہ رقم صوبیدار دربار سنگھ کی بیٹی اجیت کور نے دی تھی" — اُس نے کہا — "کہتی تھی کہ یہ مقدمے پہ خرچ کرو اور لبشیرے کو چھڑاؤ۔ مجھے اور کچھ بھی معلوم نہیں۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ لبشیرے

اور اجیت کور کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ میں نے چھوٹے تھانیدار سے کہا کہ ضمانت کرانے کے وہ کتنے روپے لے گا۔ اُس نے پانچ سو روپے مانگے۔ میں نے پانچ سو دے دیئے۔ اُس نے مجھے ایک وکیل کرا دیا۔ پانچ سو روپیہ اُس نے لے لیا اور اُس نے کہا کہ وہ اِس رقم میں سارا کیس لڑے گا۔ باقی پانچ سو میرے گھر میں ہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ بشیرے کی ہندوؤں کے ساتھ لڑائی کیوں ہوئی تھی۔"

واہگورو کی پیاری

میں نے اُسے وہاں سے ہٹا کر اجیت کور کو اندر بلا لیا۔ اُس کے چہرے پر ذرا سی بھی گھبراہٹ نہیں تھی، بلکہ اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا جس سے وہ اور زیادہ حسین اور پاک لگتی تھی۔

"اجیت کور!" — میں نے شفقت کے لہجے میں کہا — "میں یہ نہیں کہوں گا کہ تم نے چوری کی ہے۔ یہ تمہاری اپنی رقم تھی۔ تم جسے چاہے دے دو۔ تمہارے ماں باپ کو معلوم نہیں تھا ورنہ وہ اِسے چوری نہ کہتے۔ یہ آدمی جو ابھی یہاں سے باہر گیا ہے کہتا ہے کہ تم نے اسے اس رومال میں بندھی ہوئی رقم دی تھی اور کہا تھا کہ یہ بشیرے کے مقدمے پر خرچ کرو۔ کیا یہ آدمی سچ کہہ رہا ہے؟"

وہ خاموش رہی لیکن اُس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ آئی، بلکہ

اُس کے ہونٹوں پر جو تبسّم تھا وہ اور زیادہ کھل گیا۔

"کہہ دو، یہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے" ــــ میں نے کہا۔

"واہگورو کی پیاری جھوٹ نہیں بولے گی تھانیدار ا!" ــــ اُس نے تبسّم کو قائم رکھتے ہوئے کہا ــــ "میں سوچتی تھی کہ بات چھپی رہی تو چپ رہوں گی، بات کھل گئی تو جھوٹ نہیں بولوں گی" ــــ اُس نے گورمکھی کا ایک شبد سنا دیا اور اس کا ترجمہ کیا ــــ "جھوٹ بولنے والے کو جھوٹ میٹھا لگتا ہے لیکن یہ ہوتا زہر ہے اور سچ زہر جیسا کڑوا ہوتا ہے لیکن ہوتا تریاق ہے۔"

وہ واقعی ابنارمل لڑکی تھی لیکن باتیں عقل کی کرتی تھی۔

"بشیرے کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"وہی جو سگے بھائیوں کے ساتھ میرا تعلق ہے" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "جو آدمی کسی عورت کی عزّت بچاتا ہے، وہ اُس کا بھائی نہیں ہوتا تو اور کیا ہوتا ہے۔"

"مجھے پوری بات سناؤ گی؟" ــــ میں نے کہا۔

"کیوں نہیں سناؤں گی، لیکن تھانیدارا! میری بات پر تم اعتبار نہیں کرو گے!"

"ضرور اعتبار کروں گا اجیت کور!" ــــ میں نے کہا ــــ "پھر تم جو کچھ مجھے کہو گی، میں وہی کارروائی کروں گا۔"

اُس نے جو کہانی سنائی وہ میں ذرا اختصار سے آپ کو

سناتا ہوں۔ اُس کا باپ چونکہ فوجی تھا اس لئے اپنے بچوں پر بڑی سختی کرتا تھا۔ لڑکے تو باہر ہنس کھیل آتے تھے، اجیت کور گھر میں باپ کی گھُڑکیاں سہتی رہتی تھی۔ وہ ماں باپ کے ساتھ کئی چھاؤنیوں میں رہی۔ دس بارہ سال کی عمر میں اُس نے ماں کے ساتھ گوردوارے میں جانا شروع کیا۔ گرنتھی اُس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی شبد گانے والوں کی آواز اُسے اچھی لگتی تھی۔ یہاں سے وہ مذہب کی طرف مائل ہوئی۔ وہ وقت بے وقت گوردوارے میں چلی جاتی۔ چونکہ خوبصورت بچی تھی اس لئے گرنتھی، اور "بھائی" اُس کے ساتھ پیار کرتے تھے۔

لڑکپن کے آغاز میں اُس نے شبد یاد کرنے شروع کر دیئے اور گنگنانے لگی۔ ایک گرنتھی نے اُسے ہارمونیم پر شبد گانے سکھا دیئے۔ اُس کی آواز کھُل گئی۔ زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے صوبیدار نے اپنے بیوی بچوں کو گاؤں بھیج دیا۔ لڑکے جوان ہو چکے تھے اور اجیت کور کی جوانی کا آغاز تھا۔ اس عمر تک وہ دنیا کی دلچسپیوں سے کنارہ کش ہو کر مذہب کی ہی ہو چکی تھی۔ میری رائے یہ ہے کہ باپ نے بچپن میں اس کا من مار دیا تھا۔ وہ اب واہگورو اور خدا میں پیار ڈھونڈتی تھی۔ اسی میں اُسے روحانی تسکین ملتی تھی۔

اب جوانی کی عمر میں وہ گوردوارے میں جاتی تھی تو گاؤں کے دو چار سکھ نوجوان اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

آوازے کستے تھے مگر اجیت کور کسی کی طرف توجہ نہیں دیتی تھی۔ وہ اُن کی نیت سمجھتی اور حیران ہوتی تھی کہ انسان حیوان کس طرح بن جاتا ہے۔ وہ ایسا خاوند چاہتی تھی جو شراب نہ پیتا ہو اور جو مذہب کا پابند ہو۔ ایسا کوئی سکھ نہیں تھا جو شراب نہ پیتا ہو۔ سکھوں کے ہاں جنسی غلاظت اتنی تھی کہ اجیت کور کو اُن سے گھن آتی تھی۔ یہیں سے لوگوں نے اُسے پاگل کہنا شروع کر دیا۔

اُس کے بیان کے مطابق ایک رات خواب میں اُسے بابا نانک ملے اور اُسے گاؤں سے کچھ دُور ایک سمت دکھا کر کہا کہ وہاں بڑ کا ایک درخت ہے۔ اس کے نیچے بیٹھ کر مجھے یاد کرو تو میں تمہیں کسی صبح ایک اشارہ دوں گا۔ اُس نے علی الصبح وہاں جانا شروع کر دیا۔ تین دن جاتی رہی۔ اس دوران ایک ہندو نوجوان وہاں جا کر اُس کے اِردگرد گھومتا رہا۔ یہ نوجوان راستے میں یعنی کھیتوں سے گزرتے بھی اُسے پریشان کرتا تھا۔

چوتھی صبح وہ بڑ کے درخت تلے بیٹھی عبادت میں مصروف تھی۔ ہندو ذرا پرے پرے اس کے گرد گھوم رہا تھا۔ بشیرا اُدھر سے گزرا۔ وہ بشیرے کو نہیں جانتی تھی۔ اُس نے بشیرے کو بلا کر پوچھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ بشیرے نے بتایا کہ وہ اُسی کے گاؤں کا مسلمان ہے۔ اجیت کور نے اُسے بتایا کہ یہ ہندو اُسے ہر روز آکر پریشان کرتا ہے اور بڑی گندی باتیں کہتا ہے۔ بشیرے نے اُسے کہا کہ تمہارے دو جوان بھائی ہیں، تم

انہیں کیوں نہیں بتاتیں؟ اجیت کور نے کہا کہ میں نے اپنے بھائیوں کو بتایا تو وہ اسے قتل کر دیں گے اور پھانسی چڑھ جائیں گے۔ مجھے اپنے بھائیوں کے ساتھ اتنا پیار ہے کہ میں اپنا آپ ان پر قربان کر دینا چاہتی ہوں۔ میں انہیں نہیں بتاؤں گی۔ تم اس سے لڑنا مت۔ اسے ڈرا دو کہ مجھے پریشان نہ کیا کرے۔

میں اندازہ کر رہا تھا کہ اس لڑکی کی باتیں عام انسانوں سے مختلف اور زندگی کی عام ڈگر سے ہٹی ہوئی تھیں۔ اگر وہ نارمل ہوتی تو صحیح معنوں میں سکھنی ہوتی۔ پھر کوئی ہندو اسے یوں پریشان کرتا تو وہ مردوں کی طرح اس کی بُری حالت کرتی۔ سکھوں کی عورتیں مردوں جیسا حوصلہ رکھتی تھیں۔

بشیر نے ہندو کو شرافت سے کہا کہ وہ اس لڑکی کو پریشان نہ کیا کرے۔ گاؤں میں مسلمانوں کی پوزیشن بڑی کمزور تھی۔ وہ اقلیت میں تھے اور معمولی معمولی کسان تھے۔ ہندو نے مسلمان کی للکار کا جواب بڑے رُعب سے دیا اور کہا کہ تم اس لڑکی کے باپ لگتے ہو؟ اُس نے کچھ بے جا کلمے بھی کہے۔ بشیر ابھی نوجوان تھا۔ اُس کا خون جوش میں آ گیا۔ اُس نے ہندو سے کہا کہ اب اِسے چھیڑ کر دیکھو۔ خدا کی قسم، تمہاری کھوپڑی توڑ کر دکھا دوں گا۔

اجیت کور چُپ چاپ سُنتی رہی۔ ہندو نے جو بکواس کی تھی وہ اُس نے مجھے سُنائی اور کہا کہ ہندو بڑے غصے میں چلا گیا۔ بشیر کچھ دیر وہاں

رُکا۔ اجیت کور نے اُسے بتایا کہ وہ ہر صبح یہاں عبادت کے لئے آتی ہے۔ بشیرے نے اُسے کہا کہ بے خوف ہو کر آیا کرو۔ کل میں بھی آؤں گا۔

یہ بابا نانک کا اشارہ تھا

اگلی صبح بشیرا بڑ کے درخت تک چلا گیا۔ ہندو وہاں پہلے سے موجود تھا۔ میں حیران تھا کہ ایک ہندو کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ وہ ایک سکھنی کے پیچھے پڑا رہا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہندوؤں کے پاس پیسہ تھا، نمبر دار بھی انہی کا تھا اور ذیلدار بھی اور میرا اسے۔ ایس۔ آئی رگھبیر سنگھ بھی اُن کا حمایتی تھا۔ بشیرے کو دیکھ کر ہندو نوجوان اجیت کور کے قریب چلا گیا اور اُس نے بشیرے کو للکارا۔ بشیرے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا گیا اور ہندو کے مُنہ پر گھونسہ مارا۔ ہندو کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا جو اُس نے بشیرے کو مارا۔ اس کے بعد ہندو بشیرے کو ڈنڈے اور بشیرا اُسے گھونسے مارتا رہا۔ آخر ڈنڈا بشیرے کے ہاتھ میں آ گیا۔ اُس نے ہندو کو ڈنڈے مارے۔ وہ ایک دو بار گرا اور آخر اُٹھ کر بھاگ گیا۔

بشیرے نے اجیت کور سے کہا کہ وہ یہاں سے چلی جائے ورنہ بدنام ہو جائے گی۔ لوگ کہیں گے کہ دو آدمی اُس کے لئے لڑے ہیں اور کسی ایک کے ساتھ اس کی دوستی ہو گی۔ اجیت کور حیران و پریشان چلی گئی۔ بشیرا دوسری طرف سے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ اجیت کور نے

اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر نہ کیا۔ اُسے ڈر تھا کہ اُس کے بھائی اس ہندو کو قتل کر دیں گے اور پھانسی چڑھ جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ ڈر بھی تھا کہ اُسے باپ مارے پیٹے گا۔ اجیت کور نے مجھے بتایا کہ گھر والے شاید یہ سمجھتے تھے کہ وہ علی الصبح گوردوارے میں جاتی ہے۔

دوپہر کو گاؤں میں شور اُٹھا کہ پولیس آتی ہے اور اس کے بعد اجیت کور نے یہ خبر سُنی کہ پولیس بشیرے کو پکڑ کر لے گئی ہے کیونکہ اُس نے فلاں ہندو ساہوکار کے بیٹے کو لُوٹ کر قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اجیت کور کا خون کھولنے لگا۔ غصّے سے وہ بے چین ہونے لگی۔ وہ کسی کو بتا نہیں سکتی تھی کہ بشیرے نے کسی کو لُوٹنے اور قتل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اُس نے اتنا ہی کیا کہ گاؤں کی دوسری عورتوں کی طرح بشیرے کے گھر چلی گئی۔ اُسے پتہ چلا کہ یہ تو غریب لوگ ہیں۔ بشیرے کی ماں کو اُس نے بَین کرتے دیکھا۔ وہیں اُس نے بشیرے کے بھائی کو دیکھا۔

اجیت کور کو یہ ڈر تھا کہ پولیس اُسے بھی تھانے بلاتے گی لیکن اُسے کسی نے نہ بُلایا۔ اُس نے بشیرے کے بھائی کو دیکھ لیا تھا۔ اسے دو تین بار ملی۔ اُس نے اجیت کور سے کہا کہ ہم غریب لوگ ہیں، وکیل کے لئے بھی پیسے نہیں، اس لئے ضمانت نہیں ہوتی۔ اجیت کور کو معلوم نہیں تھا کہ تھانے اور عدالتوں میں کیا ہوتا ہے۔ وہ یہی جانتی تھی کہ

بشیرے نے اُس کی عزت کی خاطر اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ بشیرے کے بھائی سے اُسے پتہ چلا کہ خاصا پیسہ ہو تو تھانیدار کو رشوت دے کر ضمانت ہو سکتی ہے اور اچھا وکیل کیا جا سکتا ہے جو بشیرے کو بری کرا لے گا۔

اجیت کور ہر لمحہ پریشان رہنے لگی۔ اُس کا دماغ اپنے انداز سے سوچتا تھا۔ اُس نے مجھے یوں سنایا — "رات بابا نانک خواب میں آتے اور کہنے لگے کہ جس نے تیرے لئے قربانی دی ہے، اُس کے لئے تُو بھی قربانی دے، یہی میرا اشارہ ہے۔ میں صبح اُٹھی تو مجھے سب سے پہلے یہ ڈیڑھ ہزار روپیہ یاد آیا جو ماں نے ٹرنک میں رکھا ہُوا تھا۔ میں نے اسے بھی بابا نانک کا اشارہ سمجھا۔ مجھے خیال آیا کہ میرے باپ کے پاس اتنی زمین ہے، اتنا زیادہ سونے کا زیور ہے۔ ماہوار اتنی زیادہ پنشن ملتی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ اُس نے ایک جگہ بہت سا روپیہ رکھا ہُوا ہے، مگر اُس آدمی کے پاس ایک پیسہ نہیں جو اکیلی دو کیلی عورت کی عزت پر قربان ہوتا اور سُولی پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مجھے اشارہ ملا کہ ڈیڑھ ہزار روپیہ نکال اور غریب آدمی کو دے دے۔"

اُس نے موقعہ کی تلاش شروع کر دی اور وہ دن آیا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنی بڑی بہن کے گھر گئی۔ بہن کے ہاں بچہ پیدا ہُوا تھا۔ وہاں بہت سی عورتیں جمع تھیں اور وہ گا بجا رہی تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کی ماں ایک چارپائی پر بیٹھی تھی۔ وہ وہاں سے اُٹھ

گئی اور چابیاں وہیں بھول گئی۔ اجیت کور نے چابیاں اٹھا لیں اور ماں سے یہ کہہ کر کہ تم چابیاں گُم کر دو گی، چابیاں اپنے پاس رکھ لیں۔ فوراً ہی اُسے خیال آیا کہ وہ ڈیڑھ ہزار روپیہ نکال سکتی ہے۔

وہاں عورتوں نے رونق بنا رکھی تھی۔ اجیت کور وہاں سے کھسک آئی۔ اپنے گھر کے تالے اطمینان سے کھولے۔ ٹرنک کا تالہ کھولا۔ بڑے آرام سے رومال میں بندھی ہوئی رقم نکال کر نیفے میں اُڑس لی۔ یہاں پھر اُس کے دماغ نے اپنے انداز سے سوچا کہ رقم غائب پا کر اُس کی ماں کہے گی کہ چابیاں اُس کے پاس تھیں اس لئے یہی چور ہے۔ اجیت کور چارہ کترنے والا ٹوکہ اٹھا لائی۔ اسے اس نے ٹرنک کے پیچھے والے ایک قبضے میں رکھا اور زور لگایا۔ قبضہ بہت پرانا اور زنگ خوردہ تھا، اُکھڑ گیا۔ اُس نے دوسرا قبضہ بھی اکھاڑ دیا۔ اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ ٹرنک کسی باہر کے آدمی نے توڑا ہے کیونکہ اس کے پاس چابی نہیں تھی۔ اُس نے یہ نہ سوچا کہ کمرے اور ڈیوڑھی کے دروازوں کے تالے تو وہ کھول کر لگا چلی ہے۔ ”باہر کے آدمی“ کے پاس ان کی چابیاں کہاں سے آگئی تھیں؟

دروازوں کو تالے اور باہر کے دروازے کی زنجیر چڑھا کر وہ بشیر سے کے گھر گئی اور اُس کے بھائی کو الگ کر کے رومال سمیت رقم اُسے دی اور اُسے کہا کہ یہ رقم کسی کو نہ دکھائے، کسی کے ساتھ ذکر نہ کرے اور اس سے اپنے بھائی کو چھڑا لائے۔

میٹھا جھوٹ اور کڑوا سچ

میں اس لڑکی کے بیان پر اس لئے حیران نہ ہُوا کہ وہ نفسیاتی کیس تھی۔ وہ نارمل نہیں تھی۔ اس کے سامنے سوال جواب محض بیکار تھے۔ میں نے اُسے یہ کہہ کر باہر بھیج دیا کہ اپنے ماں باپ کو یہ نہ بتائے کہ اُس نے مجھے کیا بتایا ہے۔

بشیرے کا بھائی باہر بیٹھا تھا۔ اُسے پھر اندر بلایا۔ اُس سے پوچھ گچھ کے دوران اے۔ ایس۔ آئی رگھبیر سنگھ اور راجیت کور کے بیانوں کی تصدیق ہو گئی۔ اس غریب آدمی نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ اُس نے بتایا کہ رگھبیر سنگھ نے، نمبردار اور ذیلدار نے ان کے گھر آ کر بشیرے کو، اور اسے مارا پیٹا، عورتوں کی بے عزتی کی اور جب بشیرے نے کہا کہ یہ ہندو صوبیدار دربار سنگھ کی بیٹی کو پریشان کرتا تھا تو رگھبیر سنگھ نے اُسے اور پیٹا اور کہا کہ اُس نے کسی لڑکی کا نام لیا تو اسے جان سے مار دیا جائے گا۔

اس دوران بشیرا بھی آ گیا تھا۔ وہ ابھی تک غصے میں تھا۔ بڑا جوشیلا نوجوان تھا۔ میرے سامنے آتے ہی بولا ——— "میری ایک بات سُن لو جناب! میں نے پہلے بھی پولیس کی بہت مار کھائی ہے، اب بھی کھا لوں گا۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ میں ضمانت پہ ہوں۔ میں سچا ہوں۔

میں نے اس لڑکی کی عزت بچائی ہے جو ابھی یہاں سے نکل کر گئی ہے۔ اگر مجھ پہ ہاتھ اٹھاؤ گے تو خدا کی قسم، ہاتھ لگا تو تمہیں اور تمہارے چھوٹے تھانیدار کو قتل کر دوں گا"۔۔۔ اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔۔۔ "اگر سچ کی سزا پھانسی ہے تو پولیس کے ایک دو تھانیدار ساتھ لے کر مروں گا۔"

بخدا اس لڑکے نے میری روح بھی خوش کر دی۔ مجھے اس کے سچ کا علم ہو چکا تھا۔ میں نے اسے بٹھا لیا اور تسلی دی۔ اُس نے اجیت کور کے بیان کی تصدیق کر دی۔ اُس نے بھی بتایا کہ رگھبیر سنگھ، ذیلدار اور نمبردار نے اُسے کس طرح مارا پیٹا تھا۔ بشیرا اجیت کور کا نام لیتا تھا تو رگھبیر سنگھ اُسے کہتا تھا کہ لڑکی کا نام نہ لو ورنہ مارے جاؤ گے۔ اُس کے خلاف قاتلانہ حملے اور لوٹنے کا کیس بنایا گیا اور وہ ہندو اس کے خلاف بیان لکھوا گئے جنہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہوا کیا ہے۔

میں نے اُسے تسلی دی کہ میں اُسے بچا لوں گا اور اُسے ٹھنڈا کیا۔

اب میرے سامنے بڑا لمبا چکر تھا۔ یہ میں مختصر کر کے سنا دیتا ہوں۔

رگھبیر سنگھ سے میں نے پوچھا کہ اُس نے ہندو لڑکے کے ساہوکار باپ سے کتنی رقم لی تھی۔ اُس نے مجھے خوش کرنے کے لئے بتا دیا کہ اُس نے ساہوکار سے چھ سو روپے لئے تھے۔ اُس نے پھر منت کی کہ میں اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں۔ اُس نے وہ پانچ سو روپیہ جو بشیرے کے بھائی سے لیا تھا میرے آگے رکھ دیا۔

میں نے اسی وقت اُس کے خلاف رپورٹ لکھی جو بڑی سخت تھی۔ آخر میں لکھا کہ اسے لائن حاضر کر کے اس کے خلاف کیس تیار کیا جائے صوبیدار وغیرہ اور دیگر تمام افراد کو جنہیں بلایا تھا، گاؤں چلے جانے اور وہاں ہر [redacted] کو تھانے بلایا اور انہیں کہا کہ میں ان دونوں کے خلاف رپورٹ لکھ کر بھیج رہا ہوں اور ان کی ذیلداری اور نمبرداری ختم کرا رہا ہوں۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئے۔ اتنی بڑی چوٹ ان لوگوں کی برداشت سے باہر تھی، لیکن مجھے کوئی رپورٹ نہیں لکھنی تھی کیونکہ ان سے مجھے ایک کام لینا تھا۔

انہیں میں نے جی بھر کے ذلیل کیا، گالیاں دیں اور کہا کہ میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔ اس طرح ان کے پاؤں تلے سے زمین نکال کر میں انہیں وہاں لے آیا جہاں لانا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر وہ اپنی ذیلداری اور نمبرداری کو بچانا چاہتے ہیں تو جس ہندو کے ساتھ بشیرے کی لڑائی ہوئی تھی، اُس کے باپ سے جا کر کہو کہ اُس کا دوست رگھبیر سنگھ لائن حاضر ہو رہا ہے اور اب کیس میرے ہاتھ میں ہے۔ اب بشیرے کی جگہ اُس کا بیٹا جیل میں جائے گا۔

پھر ان دونوں سے میں نے کہا کہ تمام گواہوں سے کہہ دو کہ تم جھوٹی گواہی دینے آ رہے ہو۔ ذرا سنبھل کر کورٹ میں آنا۔ میں سب کے خلاف جھوٹی گواہی دینے کے الزام میں مقدمہ پیش کروں گا۔

مختصر یہ کہ میں نے زبانی زبانی غیر قانونی حرکتیں کیں اور سب کو اتنا ڈرایا کہ ساہوکار تو اگلے روز میرے پاس آگیا اور ہندوؤں کے مخصوص طریقے کے مطابق ہاتھ جوڑ کر منت کی کہ میں اس کے بیٹے کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں۔ میں نے اُسے اور زیادہ خوفزدہ کر دیا۔ اُس نے مجھے بھی کچھ رقم پیش کی جو میں نے قبول نہ کی۔ میں بشیرے کو بچانے کی ترکیب کر رہا تھا۔ رگھبیر سنگھ نے جو دوسرے جھوٹے گواہ بنائے تھے (اور جنہیں میں سچا سمجھتا رہا تھا) ذیلدار اور نمبردار نے اپنی حیثیت اور عزت بچانے کے لئے توڑ دیئے۔

رگھبیر سنگھ لاتن حاضر ہو گیا۔ میں نے بشیرے کے خلاف چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ بشیرے کے بھائی نے ایک بڑا قابل وکیل ستیہ پال کھنہ کیا تھا۔ پہلی پیشی پر میں اس سے ملا اور اسے ساری کہانی سنائی اور اسے بتایا کہ میں خود ہی یہ کیس تباہ کر رہا ہوں۔ وہ بڑا مالدار وکیل تھا۔ اُس نے بڑے اونچے کردار کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے پانچ سو روپے بشیرے کو واپس کر دیئے۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ کیس کس طرح بشیرے کے حق میں ہوا۔ مختصر یہ کہ بشیرا بری ہو گیا۔

ادھر صوبیدار کے گھر کی چوری کی ایف۔ آئی۔ آر اور دیگر کاغذی کارروائی کی نقلیں ہر طرف جا چکی تھیں۔ اس کیس کو بہر حال علاقہ مجسٹریٹ کے سامنے جانا تھا لیکن میں اجیت کور کو بچانا چاہتا تھا۔ ایک دو وکیلوں اور ڈی۔ ایس۔ پی کی مدد سے صوبیدار دربار سنگھ نے اجیت کور کا

معائنہ ذہنی امراض کے ایک ڈاکٹر سے کرا کے کورٹ میں ثابت کر دیا کہ اس کا دماغی توازن صحیح نہیں۔ اس طرح اس کے خلاف کیس نہ چلا۔

ایک دلچسپ بات بھی سُن لیجیے۔ رقم ڈیڑھ ہزار چوری ہوئی تھی۔ رگھبیر سنگھ نے جو پانچ سو روپیہ بشیرے کے بھائی سے لیا تھا، وہ اس نے میرے حوالے کر دیا تھا۔ وکیل نے جو پانچ سو روپیہ لیا تھا، وہ اس نے واپس کر دیا۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ پورا ہو گیا جو پہلے رومال میں باندھ کر صوبیدار دربار سنگھ کے حوالے کر دیا گیا۔

اے۔ ایس۔ آئی رگھبیر سنگھ پہلے معطل رہا۔ اس کے خلاف انکوائری ہوئی اور اسے سروس سے برطرف کر دیا گیا۔

مجھے آج بھی اجیت کور کے الفاظ یاد آتے ہیں کہ بابا نانک نے خواب میں کہا تھا کہ جھوٹ میٹھا لگتا ہے لیکن ہوتا زہر ہے اور سچ کڑوا ہوتا ہے لیکن تریاق ہے ـــــ میری نظر میں اس لڑکی کا دماغی توازن ہم سب سے زیادہ صحیح تھا۔